جلد ۱۱
جوبلی نمبر
شمارہ ۳
حیدرآباد ٹیچر
مضامین خصوصی
تعلیمات کی ابتدائی تاریخ
صنعتی اور سائنس کی ترقی
اردو کی ترقی
دورِ عثمانی وغیرہ

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے کنٹب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

مجلس ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول

عبدالنور صدیقی بی۔ اے بی ٹی (علیگ) مدیر

سعید اللہ خاں بی۔ اے ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ)

مقاصد۔ طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات تعلیمی کو شائع کرنا۔

فن تعلیم پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

انجمن اساتذہ کے مفید مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد۔ (ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سکہ رائجہ

صرف اردو حصہ ۱۲؍ سالانہ۔ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی ۱۲؍ صرف اردو ۸؍

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

ناشر: انجمن اساتذہ بلدہ واقع دفتر صدر مہتممی تعلیمات حیدرآباد دکن۔

طابع: اعظم اسٹیم پریس ٹیلیفون نمبر ۲۰۹ حیدرآباد دکن

حیدرآباد ٹیچر جوبلی نمبر

بابتہ ماہ فروردی ۱۳۴۶ ف م فروری ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین

جلد (۱۱) شمارہ ۳

تقریب

جشن سیمین اعلیحضرت قدر قدرت سکندر شوکت سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ

قطعات تاریخ

(۱)

حامیٔ دینِ مبین عثمان علیؑ ۱۳۵۵ھ — رتبہ دان وجاں نثار بوتراب

فیض سے جن کے غنی ابنائے ملک — جود سے جن کے زمانہ فیض یاب

بچہ بچہ نام پر جن کے فدا — جن کی جوبلی عید قرباں کا جواب

عہد میں ان کے ترقی وہ ہوئی — ذرہ ذرہ ہے دکن کا آفتاب

اس لئے اظہرؔ نے لکھا سالِ جشن — بارک اللہ عہد عثماں کا شباب

(۲)

مایۂ عیش وانبساط بنی — شاہِ عالی مقام کی جوبلی ۱۳۵۵ھ

کیوں نہ عالم خوشی سے ہو معمور — عید ہے خاص و عام کی جوبلی

شعر اکھرہے ہیں خوش ہو ہو — ہے ملوک الکلام کی جوبلی

کلکِ اظہرؔ نے سالِ جشن لکھا — ہو مبارک نظام کی جوبلی ۱۳۴۶ف

(۳)

فداشہ پہ جوبلی تو ہے عید قرباں — مرادیں ہو میں آج دونوں کی پوری

الف بڑھ کے اقبال کا یہ پکارا — مبارک ہو عثمانیہ جشن جوبلی ۱۳۵۵ھ

(۴)

نوشیرواں وحاتم دوراں شہِ دکن — عالم میں عدل و داد کا جن سے ہوا رواج

رونق فزائے تخت ہیں پچیس سال سے — جوبلی کا جشن کیوں نہ رعیت منائے آج

مسند نشیں بزم جو عثماں علیؑ ہوئے — توقیر و منزلت نے رکھا جھک کے سر پہ تاج

اظہر نے دی دعا کہ سلامت رہیں حضور
پوری اسی طرح ہو زمانے کی احتیاج

تاریخ جشن سے سرِ اعدا قلم ہوا
فرخندہ باد دولتِ اقبال و ابتہاج

۳۰ ۱۹

گدا زادۂ خادم الشعرائے زماں ۔ فقیر سید دلدار حسین اظہر

۱۳۵۵ھ ۳۰ ۱۹

نتیجۂ فکر جناب حکیم محمد فاضل صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

کنون کہ در کفِ گل جام ارغوانی ہست
ہزار مستِ ترنم ز شادمانی ہست

صبا بہ گلشنِ عالم مژدہ رساند
کہ موسمِ گل و ایامِ شادمانی ہست

چرا شوم پئے آبِ حیات سرگرداں
زوال بہر نفسم جوئے زندگانی ہست

ز فیضِ پیرِ مغانم بعالمِ پیری
بہر زماں طرب عہدِ نوجوانی ہست

بیا و جادہ بہ پیمابہ مسلکِ عشاق
دلا اگر ہوسِ عیشِ زندگانی ہست

ز فیضِ شہِ دکن آفتابِ علم و ادب
بر آسمان شرف در ضیا فشانی ہست

زمینِ حضرتِ عثمانؓ و نصرتِ حیدرؓ
نصیبِ شاہِ دکن فتح و کامرانی ہست

نتیجۂ فکر جناب سید علی محمد اجلال صاحب مدرس فوقانیہ چنچل گوڑہ

آصف سابع نظام الملک سلطان دکن ‏ ‏ فخر ملت فخر قوم و فخر شاہان دکن

جشن سیمیں ہو مبارک تجھکو سلطان العلوم ‏ ‏ ہر طرف ہے یہ نوائے نغمہ سنجان دکن

جمع ہے ساری رعایا گرد تاروں کی طرح ‏ ‏ انجمن آرا ہے تو اے ماہ تابان دکن

دیکھ کر اے شاہ تیرے جشن سیمیں کی بہار ‏ ‏ زر فشانی کرتے ہیں گلہائے بستان دکن

دیدنی ہے دلکشی چمکے ہوئے تاروں کی آج ‏ ‏ پڑ رہا ہے چرخ پر عکس چراغان دکن

تیری ہستی تھی نعمت دکن کیواسطے ‏ ‏ تجھ پہ فخر و ناز کرتا ہے یہ دوران دکن

درد کی تصویر تھا بالیں پہ تو آیا ہے جب ‏ ‏ جلوہ آرائی تھی تیری رازدان دکن

تیرے عہد معدلت گستر میں ہیں شیر و شکر ‏ ‏ بابیان و گبر و ترسا و مسلمان دکن

اب رسومات کہن کی گرم بازاری کہاں ‏ ‏ ہو گئیں وہ سب نقوش طاق نسیان دکن

تیرے دم سے ترک ایران و عراق و نجد ہیں ‏ ‏ ہر جگہ موجود ہیں ممنون احسان دکن

"افتخار عہد حاضر" کا لقب تیرے لیے ‏ ‏ "دار امن و عافیت" کا اسم شایان دکن

ملک و مالک دونوں وابستہ علیؓ کے نام سے ‏ ‏ پھر نہ ہو کیونکر پناہ خلق دامان دکن

ہو فزوں اقبال و عمر و دولت و جاہ و حشم ‏ ‏ دل سے کرتے ہیں دعا پیر و جوانان دکن

ہوں معظم جاہ و اعظم جاہ کی عمریں دراز ‏ ‏ ماہ تاباں یہ وہ ہیں مہر درخشان دکن

کر دعا اجلال بہر خاندان آصفی ‏ ‏ یہ رہے آباد زیر ظل سلطان دکن

نتیجہ فکر جناب مولوی عبدالحکیم صاحب مدیر مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

اے شہ ملک دکن اے خسرو عالی تبار
خاندان آصفی کی یادگار باوقار

رونق ملک دکن اور انتظام سلطنت
دم قدم سے آپ کے ہی کامیاب و کامگار

آصف ملک دکن ہیں آپ لیکن بے شبہ
آصف ملک سلیماں سے بھی بڑھکر ہے وقار

شوکت دارا کہاں اور ذات شاہانہ کہاں
آج اقبال سکندر آپ کا ہے غمگسار

ملک کی اصلاح جیسی چاہیئے کی آپ نے
آپ کے احسان کا ملک دکن ہے زیر بار

باعث فخر ممالک ہو گیا ملک دکن
فخر شاہان زماں ہیں بادشاہ ذی وقار

میر عثمان علی خاں خسرو ملک دکن

آپ ہوں فضل خدا سے شاد کام و کامگار

مسدس سرودیہ

جناب آقا محمد خاں صاحب طلعت مدرس فوقانیہ دار الشفا

بارد گر مژدۂ رحمت رسید ... از سر نو گل بچمن بر دمید
بلبل عشق از سر شاخ نوید ... نعرۂ شوق از دل وجاں برکشید

حضرت عثمان علی زندہ باد ✣ تا با بد زندہ و پایندہ باد

با ادب ای طفل دبستان شوق ... روی طرب کن سوی بستان شوق
شاہِ دکن را تو بہ ایوان شوق ... خوش بدعا باش بعنوان شوق

حضرت عثمان علی زندہ باد ✣ تا با بد زندہ و پایندہ باد

تا نم ابر و نسیم بہار ... روی زمین شد ید کن لالہ زار
ساز طرب ساز و بگو بے شمار ... از ہمہ غمہای جہاں برکنار

حضرت عثمان علی زندہ باد ✣ تا با بد زندہ و پایندہ باد

تا کہ قمر جا بہ سما میکند ... از رخ خور کسب ضیا میکند
آصف ہفتم کہ عطا میکند ... طلعت بیچارہ دعا میکند

حضرت عثمان علی زندہ باد ✣ تا با بد زندہ و پایندہ باد

افتتاحیہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست ۔۔۔ آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم شمس الملت والدین نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصف سابع شہریار دکن وبرار خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ۱۹۱۱ء میں سریر آرائے اورنگ حکومت ہوئے اس موقع پر ایک سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ

"ہر طرح میں اپنی عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ممکنہ کوشش کروں گا"

آخر میں حضرت غفران مکان کا مشہور شعر بھی ارشاد فرمایا تھا جو درج ذیل ہے:-

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ ۔۔۔ گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

آج جب کہ مسند نشینی کے ۲۵ سال گذر چکے ہیں اور ہم نمک خواراں و خیر طلبان کے دل خوشی سے معمور ہیں ان آنکھوں نے نطق ہمایونی کو حرف بحرف پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اس دور مبارک کی ترقی نہ صرف عہد آفریں بلکہ محیر العقول ہے۔

سلطان العلوم نے اپنی عزیز رعایا و برایا کی ہر جہتی سود و بہبود کے لئے جو کچھ کیا اس کا حصر اس رسالہ میں ممکن نہیں بلکہ ایک دفتر کا محتاج ہے۔ ویسے تو اس ابر کرم سے ہر چھوٹا بڑا سررشتہ سیراب ہوا مگر اس نے سررشتہ تعلیمات میں ابر نیساں کا کام کیا۔ معارف پرور شاہ ذیجاہ کی ادنیٰ توجہات سے جو ترقی اس سررشتہ میں ہوئی اُسے نشاۃ ثانیہ کہا جائے تو بجا ہے جس پر ابنائے ملک جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۹۱۱ء میں جملہ مدارس (۱۰۳۲) تھے جن سے صرف (۶۶۴۸۴) طلبہ استفادہ کر رہے تھے۔ بخلاف اس کے ۱۹۳۵ء میں مدارس کی تعداد (۴۷۴۶) تک پہنچ گئی جن میں (۲،۵۳،۵۸۲) طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ مسند نشینی کے وقت تعلیمی اخراجات صرف ۱۴ لاکھ تھے؛ مگر اب ایک کروڑ سے زائد ہیں۔ اس وقت اگر مدرسہ جانے والی آبادی کا تناسب ۵ فیصد تھا تو اب ۱۸ فیصد یعنے تقریباً چوگنا ہے صرف ذکور کی آبادی کے اعداد دیکھے جائیں تو وہ اور بھی حیرت انگیز ہیں ۱۹۱۱ء میں

اس کا تناسب ۹ء۵ تھا تو اب چھ گنا یعنے ۳۰ فیصد ہے۔ ان سب ہمہ جہتی ترقیوں کے علاوہ وہ عظیم الشان کارنامہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا اور جس نے تن بے جان میں روح پھونک دی اور جسم نامی بخشا وہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ مبصرین اور ماہرین جو لارڈ مکالے کے فرسودہ ڈگر پر چل رہے تھے اور ہمارے اقدام کو شبہ کی نظر سے دیکھنے اور مذاق اڑانے میں بھی کمی نہیں کرتے تھے، جامعہ کے حوصلہ افزا نتائج، غیرمعمولی ترقی اور ذخیرۂ ادب کی فراوانی دیکھکر انگشت بدنداں ہیں۔ اب تو تمام اقطاع ہند میں یہی چرچا ہے کہ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہو۔

اس مبارک دَور کے آخری نصف حصہ میں متعدد علمی، ادبی، زراعتی اور تاریخی رسالے وغیرہ معرض وجود میں آئے لیکن زمانے کی ستم ظریفی اور بدمذاقی کے باعث ختم ہو گئے۔ اسی زمانے میں رسالہ حیدرآباد ٹیچر نے بھی جنم لیا۔ اور بحمد اللہ اپنی زندگی کے گیارہ سال پورے کرلئے۔ اس مدت میں خالص فنّی اور نفسیاتی مضامین، نیز اساتذہ کے تجربات معلمی کو شائع کر کے رسالہ نے ملک کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کے مقاصد کی نشر و اشاعت اور اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنے میں جو کچھ کامیابی اُسے نصیب ہوئی اس کا اندازہ ہر شخص بخوبی کرسکتا ہے۔ غرض کہ جس قدر بھی چہل پہل اور گرم بازاری ہم دیکھ رہے ہیں وہ حضرت سُلطانُ العلوم کے علمی تبحر اور کمال ادبی ذوق کے برکات کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس مسرت و ابتہاج کے موقع پر حیدرآباد ٹیچر بکمال عجز و الحاح بارگاہ خداوندی میں ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے۔

الٰہی ہمارے بادشاہ جمجاہ کو تا دیر سلامت با کرامت رکھ آمین۔

عہدِ عثمانی
اور
اُردو کا قِران السّعدین

شاہ علی بندہ
از مولوی سعید الدین خاں صاحب بی، اے، (ڈپ ایڈ عثمانیہ) صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ

مَلِیکُنَا الدّابِعُ السّلطَانُ آصِفُ جَاہٗ
فَخرُ السّلَاطِینِ مَن جَلّت مَاثِرُہٗ

تکوین عالم سے یہ بات ہوتی چلی آئی ہے اور تاریخ بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک مرکزی شخصیت کا متلاشی رہا ہے تاکہ اپنی شان عبدیت میں معبودیت کا جلوہ دیکھ سکے۔ یہ امر نہ صرف مذہب ہی سے مختص ہے بلکہ ارتقائے تہذیب و تمدن کے ہر دور میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ انسان اپنی سماجی تنظیم اور معاشرتی زندگی کے انضباط میں اسی ایک چیز کا محتاج رہا ہے۔ دورِ جہالت میں اگر یہی چیز امیدوں کا ملجاو ماوی تھی تو موجودہ متمدن دنیا میں بھی ہماری تمناؤں اور آرزوں کی یہی آماجگاہ ہے۔ مشرق کے اس جذبۂ بادشاہ پرستی اور ملوکیت کو ظل اللہ کے مذہبی تصور نے اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے چنانچہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد اس خصوص میں بہ نسبت اور ممالک کے بہت زیادہ ممتاز ہے، اور اپنے شاہ جمجاہ کے آستان کی جبیں سائی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

راجا اپنا شاہ عثمان اس کے ہم سب پرجا ہیں
پیارے دیس کا پیارا راجہ جگ جیون سے پیارا ہے

آج جبکہ خسرو کیواں حشم کے جشن سیمین کا روز سعید ہے، ہر گھر شادی کی نوید ہے۔ صبح طرب خیز اور نسیم معطر و عنبر بیز ہے ملت دکنی کا یوم عید ہے ناچیز حیدرآباد ٹیچر بکمال ادب حضور شاہانہ میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے۔

لہ اس مضمون کی تیاری میں رہبر، صبح دکن، نظام گزٹ، منشور، آئینہ ادب، کے سالنامول اور رسالہ اُردو اور جانکی پرشاد کی کتاب "عصر جدید" سے مدد لی گئی ہے ترقی اُردو کا زیادہ تر مواد زور صاحب کی کتاب "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" سے ماخذ ہے۔

تجھے یہ جشن عشرت خسرو گیہاں مبارک ہو
مبارک ہو مبارک، ہر دم و ہر آں مبارک ہو
یہی کہتے ہیں سب تیرے فدائی شادماں ہو کر
دکن کا تخت اکلیل و حشم عثمان مبارک ہو — آمین

کسی قوم کے عروج و اقبال کا زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ تاریخ ہمیشہ واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے مسلمان بھی اس فطرت کے قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکے۔ اسلام نے ان کو جو نظام تمدن دیا تھا اس کو انہوں نے بالکل محو کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی عظمت و شوکت، سطوت و جبروت خاک میں مل گئی۔ نہ عربی ہی باقی رہے اور نہ عجمی، نہ ایرانی ہی رہے اور نہ تورانی، نہ اندلس کے غازی رہے اور نہ مصر کے مجاہد، نہ اکبر کی سی وسیع المشربی باقی رہی اور نہ اورنگ زیب کی سی علو ہمتی اور مذہبی عالی خیالی۔ غرض جب ہر طرف جہل و باطل کی تاریکی پھیل گئی اُفق دکن سے اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا آفتاب اقبال طلوع ہوا اور سارا ہندوستان جگمگا اٹھا۔

شہریار علم پرور خسرو گیہاں مدید
میر عثمان علیخاں سرور گردوں سریر
فرۂ عباسیاں از غرۂ او آشکار
جلوۂ الپ ارسلاں از پرتو او مستنیر
تازہ از وے دولت ثقلین و نور مشرقین
زندہ از وے سطوت غرناطہ و وادی الکبیر

ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا رفیع المرتبت فرمانروا ملا اور یہ امر باعث صد افتخار و ناز ہے کہ پروردگار عالم نے ایسا خجستہ صفات بادشاہ عطا فرمایا جس کی رائے صائب، نظر عمیق، طبع سلیم، دماغ روشن، دل منور ہے، جو فرض شناس اور نکو کرداری کا مکمل نمونہ ہے۔ جس کا تدبر ملک کے لئے باعث فخر و مباہات ہے جس کی رواداری ضرب المثل ہے، جس کی علم دوستی اور ادب نوازی قومیت اور وطنیت کے حدود سے بالاتر نظر آتی ہے،

جس کی آزاد مشربی اور روشن خیالی سے کورانہ رسم و رواج اور جاہلانہ توہمات مٹ رہے ہیں اور قومی مستقبل درخشاں اور تابناک نظر آرہا ہے، جس کی ترقی پسندی سے دکن تعمیری، ذہنی و مادی، علمی و روحانی ترقی کے شاہراہوں پر گامزن ہے جس کی سادگی، نصفت پسندی، معارف نوازی، معدلت گستری قرون اولیٰ کے اکابر اور اعاظم اسلاف کی یاد دلاتی ہے، جس کا جذبۂ ہمدردی و ایثار شاہان اسلام کی حقیقی عظمت کو نمایاں کرتا ہے، جس کا ندرت بیان مجتہدانہ اور عالمانہ ہے، جس کے علم و فضل کا سہیم و شریک کوئی نہیں۔ وہ جو سلطان العلوم ہے "جس کی شاعرانہ قوت ابوالعتاہیہ کی بدیہہ گوئی کی یاد دلاتی ہے، جس کا شاعرانہ ذوق اور منظوم واقعہ نگاریاں حافظ و فردوسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں جس کی اجودھیا کی بھیلی زبان کی البیلی ٹھمریاں کبیر اور کالیداس کو گنگ کر دیتی ہیں۔ جس کی غیر معمولی بلند نظری کا پتہ اس عالیہ فرمان کے نفاذ سے چلتا ہے جس میں نقرئی جوبلی کی نمائش و نمود کو بند کرنے اور نہایت عظیم الشان شفاخانہ امراض اطفال قائم کرنے اور ہزارہا معصوم بچوں کو موت کے چنگل سے چھڑانے کا حکم شرف صدور لاتا ہے دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی ایسا تاجدار اور فرمانروا نہیں ملیگا جس نے اپنی تخت نشینی کی تقریبات میں لہو و لعب اور مشاغل تفریح پر دولت بہانے سے اجتناب کیا ہو لیکن یہ خصوصیت یہ امتیاز صرف خسرو دکن کے لئے مختص ہو چکا تھا۔

دور آصف جاہی کے اس عہد زریں کی اتنی لاتعداد برکات اور بے شمار خوبیاں ہیں کہ بے اختیار زبان پر یہ شعر آجاتا ہے۔

روز و شب عید و براتست بہ دوران شاہ
بشد الحمد عجیب لیل و نہار است اینجا

کوئی شعبۂ نظم و نسق، کوئی معاملۂ علم و فضل ایسا نہیں نظر آتا جس پر حضور اقدس و اعلیٰ نے توجہ نہ مبذول فرمائی ہو اور جس کی اصلاح و تکمیل کے لئے ہر ممکن تجویز کو منظوری کا شرف عطا نہ فرمایا ہو۔ چنانچہ عنان حکومت سنبھالتے ہی حضرت جہاں پناہی نے ملک کے دستور اور اس کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کی اور ۱۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو قصر شاہی میں دربار منعقد کر کے باب حکومت کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ ایک فرمان کے ذریعہ غریب کاشتکاروں کو

خود غرض اور بے رحم سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دلائی گئی۔ غرض یہ اور اسی نوعیت کی دیگر چیزیں مثلاً عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر کی تعمیر، تنگبھدرا پراجکٹ کی اسکیم، نلوں کی تنصیب، برقی روشنی کا تعارف، ڈرینج کی تکمیل، ریلوے کی خریداری، موٹر بسوں کا انتظام، ٹیلیفون اور محکمہ آرائش کا قیام، کھیلوں کے میدان اور پندرہ سو سے زیادہ جدید پختہ شوارع کی تعمیر، مدینۃ الجامعہ، پتھر گٹی، نامپلی، نے پل، ملک پیٹھ، عنبر پیٹھ اور رود موسیٰ کے کنارہ کی عمارتوں کا سلسلہ، آزمائشی مزرعات پر کاشت اور تبلیغ، زرعی، مرغبانی اور باغبانی کے مظاہرے، پارچہ بافی اور دیاسلائی کے کارخانوں کا قیام، امداد باہمی کی تحریک، دور دراز علاقوں میں طبی امداد و معاونت کی توسیع، پلیگ اور ملیریا کے دفعیہ کی تدابیر، محکمہ جات معلومات عامہ، امور دستوری اور بلدیہ کا قیام، طیران گاہ اور نشر گاہ کا تعارف، برطانوی فوج کے دوش بدوش فوجوں کی اصلاح و تنظیم، عدلیہ کی عاملہ سے علحدگی، اقتصادی پستی اور کساد بازاری کے باوجود بلا قطع و برید مصارف آمدنی کی توفیر، ابتدائی تعلیم کی توسیع دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کا قیام، اُردو کو ایک مکمل اور علمی زبان بنانے کا سہرا۔ تاجدار دکن کے وہ لافانی کارنامے ہیں جن کو زمانہ اگر کوشش بھی کرے تو محو نہیں کر سکتا۔

"اہل ہند کے لئے ذریعہ تعلیم زبان انگریزی قرار دی جائے"۔ نہیں معلوم کس غضب کی اثر آفرینی اس رائے میں تھی کہ جب ایک بار اس نے دل و دماغ پر قبضہ حاصل کر لیا تو اس سیلاب کی تند موجوں میں مادر ہند کے مایہ ناز سپوتوں کی نازک دماغیاں تنکوں کی طرح بہ گئیں۔ انہیں اس کی طوفان خیزی نے اتنا مبہوت کر دیا تھا کہ وہ سہواً بھی اس طرف متوجہ نہ ہو سکے کہ آیا اس طرح سات سمندر پار کی بولی کو بھارت ماتا کے چالیس کروڑ بسنے والوں کے لئے جن کی رفتار گفتار، مغربی طرز ماند و بود سے بہت زیادہ جدا ہے اگر ذریعہ تعلیم قرار دے دیا جائے تو آیا یہ روش ان کے ابنائے وطن کو منزل مقصود تک پہونچا بھی سکے گی یا اس کے مصداق ہو کر رہ جائے گی؟

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

بہرحال زمانہ گزرتا گیا اور لکیر کے فقیر ہندوستانی اپنے اس ڈگر پر غیر مانوس زبان کی سختیوں سے ہر ہر قدم پر دوچار ہوتے شاد یا ناشاد گامزن رہے۔ لیکن یہ ایک پرانی کہاوت ہے "ہر فرعونے را موسیٰ"۔ جن نام نہاد بہی خواہان ہند نے اس غیر فطری طرز تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی آخر کب تک ان کا طوطی بولتا! زمانہ نے کروٹ لی اور قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اہل دکن ــــ نہیں بلکہ اہل ہند ــــ کی حقیقی صلاح و فلاح کی باگ دودمان صدیقی کے ایک لعل بے بہا کے دستہائے مبارک میں دے دی جس پر ابنائے وطن جتنا بھی ناز کریں کم ہے

آقائے ولی نعمت کی دُوررس نگاہ عالی قدر ــــ جب سے شاہ جم جاہ کے قدوم میمنت لزوم نے تخت کو زینت بخشی ہے اپنی عزیز رعایا کی زندگی کے ہر پہلو کو مرتفع فرمانے کی مساعی میں شب و روز مصروف ہے۔ یہ بات ناممکن تھی کہ رعایا کے ایک ایسے چارہ ساز راعی خلد اللہ ملکہ ــــ کی دقیقہ سنج نظر گرامی، تعلیم جیسے اہم مسئلہ سے جس پر اقوام کی ترقی و تمدن کا بالکلیہ انحصار ہے بلکہ اس دُور جہد للبقاء میں ان کے عین حیات و ممات کا سوال ہے، درگزر کر جاتی۔ یہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

حضرت بندگان عالی نے ملک و قوم کی بروقت صحیح نبض شناسی فرمائی اور جس چیز کے لئے ملک عرصہ سے تشنہ کام تھا اس کی سبیل بندی سے قوم کے تن مردہ میں جان ڈالدی

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

عادتی گراں قدر عطایا کی سرفرازی سے اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی فرماتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد قائم فرمائی۔ جس کا ذریعہ تعلیم ملک کی مروجہ زبان اردو قرار دیا گیا۔

اس خصوص میں تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰحضرت نے تعلیم ہند کے مریض کے حق میں وہ مسیحائی فرمائی ہے جس تک نہ رہنمایان قوم ہی کی نظریں جا سکتی تھیں نہ زعمائے ملت ہی کے دماغ کی رسائی ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس خصوص میں کچھ کرنا بھی چاہتے تو ان کی مساعی خود آپ اپنی ہی بے دست و پائی کے سبب صفر کا کام رکھتیں قدرت نے

ازل ہی سے خدا یاں بارگاہ کے فرقِ عالی کو اس سہرے کی عزت سے زینت بخشی تھی کہ جہاں ظل اللہ کی ذاتِ گرامی تاج و تخت کے لئے باعثِ صد افتخار ہے وہاں اقلیم علم کے لئے بھی موجب ہزار ہزار برکاتِ الٰہی ثابت ہو۔

اول اول اس اصول پر کہ زبان ملکی ذریعہ تعلیم قرار دی جائے بعض سخن ناشناس اہل وطن نے منہ آنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ اصول حقیقت شناس، دقیقہ سنج، دُور رس شاہانہ نظر و بصر کا نتیجہ تھا معیار پر کب پورا نہ اترتا۔ مادر علمی کے سپوتوں کے شاندار کارناموں نے کیا یورپ اور کیا ہندوستان سب ہی جگہ اس کا لوہا علی الاعلان منوا دیا۔

یہ اسی شاہانہ بذل و نوال اور حکیمانہ ارشادات عالیہ کا نتیجہ ہے جو آئے دن یہ گوش گزار ہو رہا ہے کہ زبان ملکی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے بہتر نتائج کی توقع یقینی ہے" اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ اس اصول کے ظاہری منکر اس اصول پر بالکلیہ عمل پیرا ہو کر رہیں گے اور اسی طرح اہل وطن کو اس ورطۂ ہلاکت سے صاف بچائیں گے جس طرح اب اہل دکن حضرت جہاں پناہ کی شاہانہ علم پروری کے طفیل غیر زبان کی مصیبتوں سے بال بال بچ گئے ہیں۔

گفتگو کے اس نقطہ تک پہنچ جانے پر جی یہ چاہتا ہے کہ چلتے ہوئے ذرا اس پوزیشن پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جو اُردو کو اس کی سادگی، دل نشینی، گہرائی اور پُرکاری کے سبب اسکی دوسری سہیلیوں کے مقابلہ میں بھارت ماتا کی سرزمین پر اس کو حاصل ہو چکی ہے۔

اس موقع پر مذہبی عصبیت اور سیاسی داؤں پیچ کے نامعقول الزامات سے معقول عام اُردو کے دامن کو بے لوث رکھنے کے خیال سے مناسب ہے کہ اس خصوص میں ان فضلائے روزگار اور ماہران تعلیم کی قیمتی رایوں کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے جو قوم کی صلاح و فلاح کا حقیقی درد اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جن کی فضیلت اور وسعت نظر مسلّمہ ہے۔

(۱) "ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے"۔

(دیباچہ رپورٹ سائمن کمیشن)

(۲) "اُردو زبان ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے اور

جس قدر اسے فروغ ہوگا اسی قدر اِن دونوں قوموں کی یک جہتی کا باعث ہوگا"

(ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم دولت آصفیہ)

(۳) "مجھے اُردو اور اُس کی ترقی سے دلچسپی ہے"

(ریورنڈ ہارڈن صاحب مرادآباد)

(۴) "اُردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اس کو بولتے ہیں عام اس سے کہ ان کا کیا مذہب و ملّت ہے۔ اس زبان کے ہندوستان میں چودہ کروڑ بولنے والے ہیں"

(نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات و تعلیمات دولت آصفیہ)

(۵) "جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانی لوگ آباد ہیں وہ ہندوستانی بولتے ہیں"

(ڈیلیگیٹ جنوبی آفریقہ)

(۶) "ہماری اُردو زبان کی بنیاد ہی قومی اتحاد پر قائم ہے اور اس کا وجود باہمی اتفاق کا ثبوت ہے بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہندو شعراء و مصنفین کی خدمات بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔ ایک طرف نسیم کا سدا بہار گلزار اُردو نظم کے چمن زار کی رونق بڑھا رہا ہے تو دوسری طرف سرشار کا زندہ جاوید آزاد اُردو نثر کی ترقیوں کا افسانہ سنا رہا ہے۔ اس وقت بھی اُردو کو رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اور ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے سے بزرگوں کی سرپرستی اور حضرت کیفی دہلوی کے سے عالموں کی امداد حاصل ہے"

(عالیجناب خان بہادر اسد اللہ محمد امیر احمد خاں صاحب والئی محمودآباد)

(۷) سب سے آخر لیکن بہت ہی اہم :—

(الف) "۱۸۱۹ء میں سری مد بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اُردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمّٰی "آئینۂ مستور" کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔ اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں اُردو کہاں تک جاری و ساری تھی"

(ب) "اشٹک چالیسی" استوتر یعنی وظیفے کی ایک اُردو کتاب ہے۔ یہ اُردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفے یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے"

(ج) "یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اُردو سے کام نہ لیا گیا"

(د) "منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے، تمنا اور خوشتر وغیرہم حضرات نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ تمام اُردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا مہاتم، شوپران، گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نولکشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں"

(ہ) "بہت سے اپنشد اور چھوٹی شاستر اور سمرتیاں اُردو نثر میں منتقل ہو کر شائع ہوئیں، اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے"

(و) "سرور جہاں آبادی کی تصنیف اس وقت مولود شریف کے جلسوں میں نہایت خلوص سے پڑھی جاتی ہے اور اتنی ہی دلچسپی سے سُنی جاتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سرور جہاں آبادی ہندو ہی رہے اور ہندو ہی مرے"

(بندرابن برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

یہ ہیں چند ایک نمونے ان بے شمار مستند ترین اقوال کے بحر زخار سے، جو اُردو کے شیدائی، اس کے حامی، اس کے نکھارنے، بنانے اور سنوارنے والے کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عیسائی اس کی شیرینی، عذوبت، مقبولیت، وسعت اور شان و شکوہ کے مدنظر اس کے متعلق رکھتے ہیں جن کا تفصیلی حوالہ بجائے خود ایک مستقل عنوان کا طالب ہے۔ ان اقوال کو غیر جانبدارانہ طور پر پرکھنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ اُردو ایک ہر دلعزیز

معقول عام مشترکہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں برابر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔
پس اندرین حالات اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینا اس کے چودہ کروڑ گلے لگانیوالوں پر ایک
لازوال احسان ہے جو رہتی دنیا یادگار رہیگا۔

عطا شدہ نعمت کی شکرگزاری از دیاد نعمت کا باعث ہوتی ہے۔ اس لئے اس
مُبارک و مسعود جشن سیمین عثمانی کے موقعہ پر ہر شخص اپنی بساط کے موجب بارگاہ جہاں پناہی
میں جب ناچیز ہدایائے عقیدت پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہے تو ہر دل عزیز اُردو
کے کثیر تعداد نام لیواؤں کی جانب سے یہ ایک کھلی احسان فراموشی ہوگی کہ اس تقریب محمود
کے موقعہ پر اپنے عمیق جذبات ممنونیت کو بے نقاب کرنیکی ایک حقیر کوشش بھی نہ کریں۔

اس حقیقت کے مدنظر اس مُبارک جشن مسعود کی تقریب میں اُردو کی جانب سے
بصد ادب اس امر کے اعتراف کی عزت حاصل کی جائیگی کہ کس طرح اس عہدِ میمنت مہد
میں یہ بھولی بسری اور بے آسرا بولی شاہانہ سایہ عاطفت میں پروان چڑھ رہی ہے اور
کس طرح دوآبہ گنگ وجمن کا یہ خودرو نونہال شاہانہ کرم عمیم کی لگاتار بارش سے سینچے
جانے کے سبب دکن کی آب و ہوا میں ایک لہلہاتا ہوا، شاداب اور تناور درخت
بن گیا ہے جس کے پھولوں کی عنبر بیز خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل کر جہاں پناہ کی غریب
نوازی علمی سرپرستی اور سب سے بڑھ کر رعایا پروری کا علی الاعلان پرچار کر رہی ہے۔

اس موقع پر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس تمہید کو اس دعا پر ختم کر کے اصل مضمون
کی طرف رجوع کیا جائے۔

عمرت دراز باد کہ تا دور مشتری
ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ زبان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے
اور اس کا انحطاط اور ترقی اسی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اُردو زبان کی قسمت بھی
اس کے بولنے والوں کی قسمتوں کے ساتھ بدلتی گئی۔ جب تک بیجاپور گولکنڈہ دہلی اور
لکھنؤ میں حکومت تہذیب اور تمدن کا زور بندھا رہا زبان بھی منجھی رہی اور جہاں اس کو ادبار کی

صورت دیکھنی پڑی یہ بھی حضیض نکبت میں جاگری۔ غدر کے بعد رامپور اور حیدر آباد دو ہی ایسی ریاستیں تھیں جو برسر اقتدار اور علم و ادب کے گہوارے تھیں۔ یہاں اُردو نے پھر نشو ونما پائی اور حیدر آباد میں تو جو اس کا جم بھوم تھا جب یہ واپس ہوئی خوب ہی پروان چڑھی۔ نواب شمس الامرا اور ان کے احباب نے اس کو علوم و فنون سے مالامال کیا تو آصف جاہ سادس نے اس کو دفتری حیثیت دیکر محبوب ترین بنا دیا۔ دور عثمانی میں تو اب یہ طوفانی رفتار اور برقی سرعت کے ساتھ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پنجاب بھی آج کل اُردو زبان کی بہت خدمت کر رہا ہے لیکن وہ ادب لطیف اور صحافت کی حد تک محدود ہے۔ حیدر آباد کی خدمات بالکل جداگانہ نوعیت کی ہیں۔ وہ جدید علوم و فنون سے اُردو کے خزانہ کو مالامال کر رہا ہے اور لفظی خزینہ میں وسعت دے رہا ہے۔ چنانچہ اس ربع صدی میں اس میں اس قدر نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے اور یہ اتنی منقلب ہو گئی ہے کہ ہر شخص انگشت بدندان ہے مفصلہ ذیل اقتباس سے مقابلہ کرنے پر آپ پر یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے گی کہ زبان نے کتنے مدارج طے کر لئے ہیں اور وہ اب کتنی نتھری ستھری ہو گئی ہے۔

> لالہ نافرمان۔ سوسن ہزار زبان۔ نرگس حیران قسم قسم۔ رنگ رنگ کے پھول پھول رہے ہیں۔ پیارے پیارے سہانے درختوں پر صبح شام کو دھوپ چھاؤں کا عالم۔ پتوں پر شبنم کی طراوت اور نم۔ ڈالیوں پر چڑیوں کا غل۔ پریوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ۔ نوجوانوں کے غول اجولیوں کی ہنسی ٹھٹول۔ کہیں گل کے قہقہے۔ کہیں بلبل کے چہچہے ہیں۔ مور ادھر شور کرتا ہے ادھر مستوں کا جنون زور کرتا ہے۔ کوئل وہاں کوک اٹھتی ہے سینہ میں یہاں ہوک اٹھتی ہے۔ پپیہا جو ادھر بولا "پی کہاں" تو پھر یہاں بدن میں جی کہاں!!

یہاں ایک بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حیدر آباد نے گزشتہ پچیس سال کے عرصہ میں قدیم رنگ کو ترک کر کے نمایاں فرق پیدا کر لیا اور تحریر کو بھی معیاری بنا لیا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی کے تدریجی تغیر کا مثل رسم و رواج لباس اور خیالات کے زبان پر بھی اثر پڑنا

ضروری تھا چنانچہ اس عرصہ میں جو زبان تیار ہوئی وہ دَورِ حاضر کی جدید معیاری اور دکن کی قدیم معیاری اردو سے مرکب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جب اُردو کی تہی مائگی اور بے بضاعتی کا علم ہُوا تو مجلس وضع اصطلاحات کا وجود عمل میں آیا جس نے ہزاروں اُردو اصلاحیں مثل تپش مطلق،

(Absolute temperature) ترشہ (Acid) قانون اجانب

(Aliens Acts) بادپیما (Barometer) تمثیل کاذب (Analogy)

(false) تلازم (Association) ادراک (Perception)

ہندسۂ تحلیلی (Analytical geometry) محرکات (Dynamics)

وفاق (Federation) نصفت (Equity) مائع پیما (Hydrometer)

رقاص (Pendulum) عصب (Nerve) طیف (Spectrum)

امیر جامعہ (Chancellor of University) برقانا (Electrify)

قرنبیق (Retort) کارکردگی (Efficiency) لاشعاعیں (X-rays)

شرپیچ (Screw-jack) محوری سطح (Axialplane) پس منظر (Back ground).

وطن آبائی (Father land) انسیات (An thropology) تجاذب

(Gravitation) کثافت اضافی (Relative density) نشرگاہ

(Broadcasting station) عمل (Laboratory) عدسہ (Lens)

معاشیات (Economics) حیاتیات (Biology) وغیرہ۔

بنا ڈالیں جو علوم و فنون کے بڑھتے ہوئے مطالعہ کے ساتھ ساتھ روز بروز نکسالی اور عام تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اگر ایسے نازک زمانہ میں جبکہ ہر طرف انگریزی کا بول بالا ہے۔ اعلیٰحضرت سلطان العلوم اس کی دستگیری نہ فرماتے تو یہ صرف ایسی بولی بن کر رہ جاتی جو گل و بلبل کی شاعری سے متعلق ہوتی۔

حضرت خسرو ذی شان کی فیاض سرپرستیوں نے اُردو میں ایسی بیش بہا کتابیں تیار کر دیں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو شاید صدیاں درکار ہوں گی۔ انجمن ترقی اُردو، دارالترجمہ

علاوہ دیگر خانگی اداروں نے سینکڑوں اعلیٰ درجہ کی تاریخیں، جغرافیئے، سفرنامے ہندوستان ایشیا، یورپ دکن اور دوما کے متعلق شائع کئے۔ معاشیات، نفسیات، سیاسیات، قانون و عمرانیات پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ لیکن یہ وہ علوم ہیں جو پہلے سے ہندوستان کی کسی نہ کسی زبان میں موجود تھے۔ دور عثمانی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جدید علوم و فنون مثلاً کیمیا، طبیعات، ہیئت، ریاضیات، نباتیات، حیوانیات، طب، انجینرنگ کی معیاری کتابوں کو دس پندرہ سال کے اندر اندر اردو میں منتقل کردیا گیا جو معجزہ سے کم نہیں۔ یورپ جدید کے ان جدید علوم و فنون کے شہ پاروں کا اردو میں منتقل ہوجانا اردو دنیا کی ایسی خوش قسمتی ہے کہ دوسری ہندوستانی زبانیں جتنا بھی رشک کریں کم ہے۔

قطع نظر ان شاہکار تراجم کے جو سرکاری کوششوں سے منظر عام پر آئے فرزندانِ جامعہ عثمانیہ نے بھی تقریباً تین سو کتابیں شائع کیں جو زیادہ تر علوم و فنون اور حکمیات پر مشتمل ہیں۔ ایسے نازک زمانہ میں جبکہ ہندوستان میں اردو کا تقاعرض خطر میں پڑگیا ہے دکن سے اس قسم کی کتب کا شائع ہونا شگون نیک اور فال ترقی ہے۔ زبان وہی زندہ رہ سکتی ہے جس کے جاننے اور بولنے والوں میں جدید ترین ضروریات علمی و ادبی کے احساس کا فقدان نہ ہو، جن میں نہ صرف زمانہ کے ساتھ دینے کی صلاحیت ہو بلکہ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود علمی و ادبی خدمات کے انجام دینے کا ذوق وشوق بھی ہو۔

موجودہ زمانہ میں جیسے جیسے مذہبی اختلافات اور رسم الخط کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک خلیج حائل ہوتی چلی جارہی ہے۔ حیدرآباد اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے کہ وہ اس قسم کی فرقہ پرستی اور مذہبی مناقشات سے کوسوں دور ہے۔ یہاں صلح و آشتی کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور اردو کی مقبولیت ہندوؤں میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے جس کا ثبوت ہمیں جامعہ کے اس اعلیٰ امتحان سے ملتا ہے جس میں وہ برابر کئی سال سے مسلمان طلبا پر سبقت لی جارہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۲ تک ۵۱ طلبا نے ال۔ ال۔ بی کی ڈگری حاصل کی جن میں ۳۱ ہندو اور ۲۰ مسلمان تھے۔ کیا اس نتیجہ کے

علم کے بعد اس حقیقت سے کسی کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے کہ عہد عثمانی میں اردو زبان کو غیر معمولی درجۂ قبولیت حاصل نہیں رہا ہے اور اس کی ہمہ گیری بڑھتی نہیں جا رہی ہے!

اُردو کا رسم الخط ایک عرصہ سے اس کی ترقی میں حارج تھا۔ حیدرآباد میں بھی اس کی اصلاح کے لئے متواتر کوششیں ہو رہی تھیں اور لاکھوں روپیہ اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو چکا تھا مگر کسی کو بھی شاہد آرزو اور عروس کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس عہد ہمایونی میں ان خامیوں کا ارتفاع ہو چکا ہے اور ایک ایسا نستعلیق ٹائپ عالم وجود میں آگیا ہے جس نے اس کو انگریزی کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ جب یہ ٹائپ عام ہو جائے گا تو اپنی برق رفتاری کی وجہ سے اُردو دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیگا۔

حضرت سلطان العلوم کا دورِ حکومت اُردو کی ترقی میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ عہد ماضی میں دہلی اور لکھنو کے فرمانرواؤں نے جو بھی اس کی سرپرستی فرمائی وہ صرف شعر و سخن تک محدود تھی۔ اس کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں کیا گیا تھا کہ دنیا کی دوسری بڑی بڑی علمی زبانوں کے دوش بدوش کھڑی رہ سکتی۔ یہ محض حضرت ظل سبحانی کی رائے صائب اور علو ہمتی کا باعث تھا کہ آج وہ ایک علمی زبان ہے اور ہر ایک سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ خود حضرت بندگان عالی سخن سنج و سخن فہم اور ایک بہت بڑے حلیت البیان شاعر اور نقاد ہیں۔ ذات شاہانہ کی بصیرت افروز تنقیدیں شمع ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ شاہ عالم پناہ کے علم و فضل اور ادبی ذوق کا اندازہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، کوئی پختہ مشق شاعر اور ادیب ہی لگا سکے تو لگا سکے۔ حضور عالی مقام کا کلام فصاحت التیام سحر حلال کا اثر رکھتا ہے اور ملک کے ادبی رنگ کو مہم نکھارتا چلا جا رہا ہے۔ خسرو ذیشان کا اُردو سے شغف اور ذوق سخن گستری ملک کے لئے نہ صرف فال نیک ہے بلکہ آب حیات کا درجہ رکھتا ہے اور باعث صد رحمت ہے۔

شاہ جم جاہ نے تخت نشینی کے بعد ہی اُردو کے مصنفین اور مولفین کی کیسی قدر افزائی اور عام علمی تحریکات کی ترویج اور نشر و اشاعت کے لئے کس فیاضی اور سیرچشمی سے کام لیا ہے اس کی تفصیل کا علم تو ہمارے حیطۂ اختیار سے باہر ہے البتہ اجمالی طور پر جو کچھ پیش کیا جائیگا اس سے یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ خسرو دکن کی ذاتی دلچسپی سے اُردو کا

مستقبل کتنا تابناک اور درخشندہ ہو گیا ہے۔

"تخت نشینی کے ساتھ ہی پہلے دو تین سال کے اندر حضرت جہاں پناہی نے شبلی نعمانی مرحوم کے لئے تین سو روپیہ ماہوار منظور فرمائی ترتیب آصف اللغات کے صلہ میں اور پانسو کا اضافہ کیا۔

۱۳۳۲ھ سے ۱۳۳۵ھ تک مدیر پیسہ اخبار لاہور کو سالانہ ایک ہزار تصانیف امیر خسرو کی طباعت کے لئے پندرہ ہزار، شفقت علی خاں شاہجہاں پوری کو دو سو روپیہ صلہ تصنیف، حبیب احمد خاں صاحب کو تصنیف کتب کے صلہ میں پانسو، عبد الرؤف صاحب شوق کو مثنوی مرقع رحمت کے لئے پانسو روپیہ یکمشت، اور پانسو جلدوں کی خریدی کا حکم۔ فرید احمد صاحب عباسی کو بصلۂ تصنیف کتب پانسو۔

اس کے بعد ۱۳۳۶ھ میں حسب ذیل امدادیں ہوئیں۔

عبد الرب صاحب کوکب کو رسالہ اتالیق کے لئے سالانہ ایک ہزار دو سو پچیس،

محب الحق صاحب بانکی پور کو تصانیف کے صلہ میں پانسو یکمشت اور پچاس روپیہ ماہوار عبد الوہاب صاحب عندلیب کو حمایت الاخلاق کے صلہ میں چار سو یکمشت اور پچاس ماہوار عبد اللہ خاں صاحب کی کتابوں کے لئے پانسو یکمشت۔ سید یٰسین علی صاحب مصنف تعزیر کو پچاس ماہوار، سید محمد حسین صاحب موہانی کو تصانیف کے صلہ میں پچاس ماہوار، مولوی عبد الحلیم شرر کو پانسو ماہوار، ظفر علی خاں صاحب کو ماہانہ چھ سو اور ان کے لڑکے اختر علی کو ماہانہ دو سو (تاکہ اپنے والد کی تصنیف و تالیف میں مدد دیں) عبد اللہ خان صاحب کسمنڈوی ایڈیٹر اسلامک ورلڈ بمبئی کو دو سو ماہوار، شفیع الدین صاحب عارف کو قطعہ تاریخ عدالت العالیہ حیدرآباد کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو وضع اصطلاحات کے لئے سالانہ تین ہزار۔

۱۳۳۷ھ میں سید مختار احمد صاحب کو "قاموس الجغرافی" کے لئے اخراجات طبع اور سو روپیہ ماہوار، عبد الماجد صاحب دریابادی مدیر رسالہ صدق کو ایک سو پچیس روپیہ ماہوار، سجاد مرزا بیگ پروفیسر نظام کالج کی کتابوں کے لئے (۱۰۰۰) یکمشت، اور دو سو ماہوار، عبد اللہ خاں صاحب (کتب خانہ آصفیہ) کے نام پچاس ماہوار، کتاب سیرۃ النبی مصنفہ شبلی نعمانی

مرحوم کی تکمیل کے لئے دوسو ماہوار، کتاب رشک قمر کی خریداری کے لئے پچاس روپئے ماہوار، سید منظر علی صاحب مشہر مصنف "اعظم الاخلاق" و اصول تعلیم کو پچاس روپئے ماہوار، عصمت النسا بیگم صاحبہ مولفہ کتاب "تحفۂ عثمانی" کو پچاس ماہوار۔ حکیم غلام احمد صاحب کو حمایت ساگر واقع حیدرآباد کی تاریخ کے صلہ میں سوا سو روپئے منصب۔

۱۳۴۸ھ میں میر قاسم علی مولف کو مفتاح الحدیث کے سلسلہ میں پچیس روپئے ماہوار، پروفیسر عبدالحی صاحب (دارالعلوم) کو کتاب المحاورات کے لئے دوسو، خواجہ حسن نظامی صاحب کو دوسو۔ محمد عبدالباری صاحب بھوپالی مولف حاشیہ "تفسیر مدارک" کو پچاس ماہوار، سید قاسم صاحب مصنف "رہنمائے حرمین الشریفین" کو بیس ماہوار، مرزا نظام شاہ لبیب کو پچاس ماہوار، لکھنو کے مشہور سوز خواں منجھو کو پچاس، سید سلیمان صاحب ندوی کو دوسو وظیفہ ماہانہ سید امجد صاحب کو تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں پچاس روپئے ماہوار، ان کے علاوہ رسالہ القریش کو پانسو روپیہ یکمشت اور دوسو ماہوار، دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نام دوسو ماہوار اور اردو گشتی کتب خانہ کو یکمشت پانچ ہزار جاری کرنے کے احکام صادر ہوئے۔

۱۳۴۹ھ میں نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی کو اردو ترجمہ "تاریخ طبری" کا انعام (الـــ) خریدی مجلہ عثمانیہ کے لئے الـــ کی منظوری، صبح دکن حیدرآباد کے پچاس پرچے خریدنے کا اور ایک سال کے لئے الـــعہ قیمت کی منظوری، اخبار صحیفہ حیدرآباد کی ڈھائی سو کاپیوں کی خریدی کا حکم، کتاب عروس الادب کے تین سو نسخے بحساب فی جلد تین روپیے چھ آنے اور رسالہ ارشاد سید یوسف الدین قادری کی پانسو جلدیں بحساب فی جلد تین روپیے چار آنے خریدنے کا حکم صادر کیا گیا۔ رسالہ معیار الاوقات صلوٰۃ ماہ صیام کی طباعت کے لئے یکمشت دو ہزار عنایت کئے گئے۔ ملا محمد واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کو پچیس روپیے ماہوار جاری کی گئی۔

۱۳۵۰ھ میں کتاب "مرقع سرشتہ" مصنفہ محمد سلطان الدین خانصاحب کی تین سو ساٹھ کاپیاں، مقامی پانچ اخباروں صحیفہ، مشیر، رہبر، صبح دکن، منشور کی پچاس پچاس کاپیاں، حیدرآباد ٹیچر کی چار سو تاسی کاپیاں، اخبار صبح دکن اور دکن پنچ کے سالانہ نمبروں کی ایک ایک ہزار

کاپیاں خریدنے کے لئے حکم صادر ہوا۔ کتب خانہ حیدرآباد ٹیچرس اسوسی ایشن کو یکمشت ایک ہزار اور ماہانہ پندرہ روپئے اور قاری عبدالکریم صاحب کو نستعلیق اُردو ٹائپ کی تیاری کے صلہ میں یکمشت چار ہزار روپئے مرحمت کئے گئے۔

ماہواروں، منصبوں اور وظائف کی نسبت یہ معلومات سطحی اور نامکمل ہیں۔ اعلیٰحضرت کا فیض جاری و غیر محدود رہے۔ یہ نامکمل مواد صرف علاقہ دیوانی کی ماہواروں وغیرہ سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ صرف خاص سے بھی امداد اور وظائف سے سرفراز کیا جاتا ہے!!

اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اُردو کی ترقی کے لئے کیسے کیسے سامان مہیا کر دئے اور مصنفین و مولفین کی کتابوں کی اشاعت اور طباعت کے لئے کتنی سہولتیں پیدا کر دیں۔ نیز ان کو اس طرح سے نواز کر ان کو کس بےفکری سے اردو کی خدمت گزاری میں سرگرم کار کیا۔

محولہ بالا اشخاص کے علاوہ اور بھی ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو دربار عثمانی سے متعلق رہے ہیں۔ ان میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ نواب صادق جنگ مرحوم نواب فصاحت جنگ، نواب حیدر یار جنگ مرحوم نواب ضیا یار جنگ، نواب اختر یار جنگ وغیرہ بہت زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان مقربین شعرا اور ادیبوں کے علاوہ مولوی عبدالحق سید خورشید علی، رائے مانک راؤ، بٹھل راؤ، راجہ راجیشور راؤ اصغر، ضامن کنتوری، عمر یافعی، سردار علی، نصیر الدین ہاشمی، علی اصغر بلگرامی، عبدالرزاق بسمل، آغا حیدر حسن، غلام محی الدین زور عظمت اللہ خاں مرحوم، قاضی عبدالغفار، میر خاں شیدا احمد، ابوالخیر خیر اللہ، ج نقوی، بیگم صغرا ہمایوں مرزا، حسین احمد بیگ، ڈاکٹر میر ولی الدین، جعفر حسن، ضیاء الدین انصاری، محمد نذیر الدین، محمد عبدالستار، عبدالقادر سروری، سید محمد، الشیخ چاند، وقار احمد، حبیب اللہ رشدی، معین الدین قریشی، حسن الدین، اکبر وفاقانی، عبدالرحمن رئیس ہوش بلگرامی وغیرہ جیسے انشاپرداز اور ادیب اور کیفی، توفیق، ذہین، ولا، امجد، صفی، عزیز، اطہر، صغیر، تشنہ، آزاد انصاری، محمد حسین آزاد، عابد، شہرت، صدق جائسی، فانی۔ بدایونی، بدر، امیر، نوری، اختر، باغ، ذکی، اشک، تاثر، شمیم، زیبا، ہیکش، جیسے شعرا فرحت اللہ بیگ، تمکین، کاظمی، ناکارہ جیسے مزاح نگار

اور ظرافت نگار، عصمت اللہ بیگ، مرزا محی الدین بیگ، فضل الرحمٰن عزیز احمد، میر حسن،
ظفر الحسن، مخدوم محی الدین سرفراز علی ہوش جیسے ڈرامہ نویس، جی شنکر راؤ، محشر عابدی، شبیر حسن، قیس
بادشاہ حسن جیسے افسانہ نویس، حکیم شمس اللہ قادری، سید احمد اللہ قادری، عبدالمجید صدیقی، محمود علی
رہبر فاروقی، سراج الدین طالب جیسے محقق اور تاریخی انشاپرداز اُردو کی بے ریا خدمت
گذاری میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی تصانیف و تالیف کے ذریعہ اُردو
کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

تخت نشینی کے بعد جب اعلیٰحضرت کی علمی سرپرستی اور ادبی قدردانی کا احساس ہوا
تو دارالعلوم میں ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا جس کے چند مقاصد یہ تھے۔

(۱) دارالعلوم کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچانا۔

(۲) علمی سوسائٹی قائم کرنا۔

(۳) "سلسلہ تالیفات اردو" کا آغاز کرنا۔

چنانچہ یہ انجمن اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب ہوئی۔ اور جس سال دارالعلوم کی ساٹھ
سالہ جوبلی منائی گئی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا بھی ڈال دی گئی جس کی تمام ترکوششیں
اُردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے وقف تھیں اور جس کا عملی نتیجہ جامعہ عثمانیہ کے قیام
کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جملہ کارروائی
اُردو میں عمل میں لائی گئی حتیٰ کہ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو اور پروفیسر ولنکر نے بھی اُردو میں تقریریں
کیں۔ کانفرنس نے اپنے دوسرے اجلاسوں میں سائنس، طب، انجینئرنگ، صنعت و حرفت
کی تعلیم کے لئے بھی اُردو کی سفارش کی جس کو شرف قبولیت بخشا گیا۔

اس انجمن کے علاوہ انجمن ثمرۃ الادب، انجمن اسلامیہ، انجمن ارباب اُردو، مکتبہ
ابراہیمیہ مجلس علمیہ، بزم اُردو نظام کالج، الٹریری اکیڈیمی، انجمن طیلسانین عثمانیہ، انجمن طلبائے
قدیم سٹی کالج، انجمن ترقی ڈرامہ، بزم تمثیل نے اپنے اپنے مقالہ جات تقاریر اور اشاعتوں کے
ذریعہ اُردو کی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔

مجلس اشاعتہ العلوم جس کے بانی مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ بہادر تھے

پانچ چھ ہزار صفحوں کی ۲۵ کتابیں جو فلسفہ وحکمت، اصول وعقائد، حدیث وتفسیر، قانون وفقہ پر
تھیں تصنیف فرما کر اردو زبان پر احسان عظیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا انجمنوں کے مقابلہ میں انجمن ترقی اردو عہد عثمانی کے بذل وکرم سے بہت زیادہ مستفید ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کی تاسیس ۱۹۰۲ میں عمل میں آئی تھی لیکن اس پر جو جمود وخمود طاری تھا وہ اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے بعد ہی دور ہو سکا اور جب ہی اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انجمن مولوی عبدالحق صاحب کی جانفشانی اور ثابت قدمی کی مرہون منت ہے لیکن اگر اعلیٰحضرت انجمن کی مستقل سالانہ امداد منظور نہ فرماتے اور موقع بموقع دیگر قیمتی منظوریاں صادر نہ کرتے تو یہ کبھی کی صفحہ ہستی سے ناپید ہو چکی ہوتی۔ حضرت بندگان عالی نے ۱۹۱۶ میں پانچ ہزار کی اور اس کے دوسرے سال اصطلاحات علمیہ کی لغت کی تیاری کے لئے تین سال تک تین ہزار روپیے کی امداد منظور فرمائی۔ نیز اس کی کتب اور رسائل خرید فرما کر اس کی سالانہ آمدنی کو ۲۳ ہزار تک پہونچا دیا۔ ان منظوریوں کے علاوہ شاہ ذی جاہ نے مزید بارہ ہزار روپیے سالانہ کی گراں قدر رقم کی منظوری دس سال کے لئے اردو کی مبسوط لغت کی تیاری کیلئے صادر فرمائی ہے۔ اس وقت تک انجمن نے ۸۰ سے زیادہ کتب شائع کی ہیں جن میں تاریخ ادب اردو، کیمیا، تذکرے اور تراجم شامل ہیں دو سہ ماہی رسالے اردو اور سائنس بھی شائع کرتی ہے جو اپنی اپنی جگہ پر برابر اردو زبان وادب کے خزانہ میں بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔

حضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی کے وقت صرف چار یا پانچ اخبار ورسائل جاری تھے لیکن ذات شاہانہ نے جب اس طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے قلم مبارک سے راست علمی وتنقیدی تبصرے اشاعت کے لئے اخباروں کو روانہ کرنے شروع کئے تو ملک میں ان سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مشیر دکن، دکن لا رپورٹ، آصفیہ گزٹ اور ادیب الاطفال حضور کی تخت نشینی کے وقت موجود تھے۔ تخت نشینی کے بعد گلدستہ نادر، شاہد سخن، دربار عثمان گزٹ، معارف، تاج، تزک عثمانیہ، رہبر مزارعین، ذخیرہ، صحیفہ، افادہ، المعالج، نظارہ، وقائع، اتالیق، ثمرۃ الادب، شعلہ دوست، رہبر، نونہال، ترقی، المعلم، النور، سائنس کی صدا، صراط المستقیم، ارتقا، تحفہ، نظام کالج میگزین، مجلہ عثمانیہ، حیدرآباد ٹیچر، کرانیکل

کشاف، ہجو لی، تجلی، آئین دکن، رعیت، دکن پنچ، دکن گزٹ، صبح دکن، منشور، مجلہ مکتبہ، ورزش جسمانی، تاریخ، شباب، سفینہ، خلیق، ترجمان القرآن، حسن کار، مجلہ تحقیقات علمیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ، پیام، وقت، الموسیٰ، شائع ہونا شروع ہوئے، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس خوش خوشی سے اس ربع صدی میں ان اخبارات ورسائل نے جنم لیا تھا ان میں کی ایک کثیر تعداد عوام کی بے توجہی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

عہد عثمانی کا سب سے درخشندہ کارنامہ جس نے اردو زبان کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا اور اس کو شاہ راہ ترقی پر گامزن کر دیا وہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر جو سیاسی، معاشی نت نئی مصیبتیں ٹوٹیں اور جو پاپڑ اس کے فقط خیال ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں جبکہ جان ہی کے لالے پڑے تھے تعلیم و تعلم کو کون پوچھتا تھا۔ لیکن نہیں۔ جب لارڈ میکالے نے اس کا ذکر چھیڑا تو بڑے بوڑھے خاموش نہ رہے اور برابر اپنی قدیم تعلیم کے دلانے پر اڑے رہے۔ لیکن میکالے کی سحر طرازی کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی اور انگریزی کا دور دورہ ہوگیا۔ ایک غیر زبان ہونے کی حیثیت سے اس نے ہم کو اصطلاحی مشکلات اور محاوروں کے پھیر میں سرگرداں رکھا۔ ہماری جدت، اصابت رائے، روشن خیالی سب غائب غلہ ہوگئی اور جودت طبع لسانی الجھنوں کے ادا کرنے میں خود الجھ گئی۔ اگر کوئی اس "ڈانٹے کے جہنم" کو پار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا اور محمد علی بنتا تو فطرت کی ستم ظریفی سے ہم سے جلد ہی رخصت ہو جاتا۔ غرض جب اس تحصیل علم سے ہماری حالت نہ سنبھلی، ہماری دماغی اور روحانی ضرورتیں پوری نہ ہوئیں اور قوائے عقلی نے جواب دینا شروع کیا تو سرزمین جاپان کے نامور کونٹ اوکوما کی سی ایک لاثانی ہستی نے جنم لیا۔ اس کی امیدیں شاہ جم جاہ کی نوازشوں سے جب پھلی پھولیں تو افق ہندوستان پر جامعہ عثمانیہ بن کر چمکیں۔ غرض وہ دن اور آج کا دن ہندوستان کے طول و عرض میں اسی جامعہ کا جس میں نئے اور پرانے علوم و فنون کا امتزاج کر دیا گیا ہے۔ طوطی بول رہا ہے اور بڑے بڑے فرعونوں نے اس موسیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

دارالترجمہ جو امیر کبیر نواب فخر الدین خاں بہادر شمس الامراء ثانی کے عہد میں چھوٹے پیمانہ پر

لیکن گراں قدر کام انجام دے رہا تھا اس کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے کر دیا گیا۔ دارالترجمہ کے تراجم کی آبیاری سے نخلِ امید سرسبز اور شاداب ہوا، تعلیم کی خامیاں دور ہوئیں اور جسم و دماغ کے ساتھ روحانی تربیت کی امید بندھی۔ خلفائے عباسیہ اور امویہ کے عہد حکومت میں صرف یونانی عبرانی اور سنسکرت کے ترجمے ہوئے مگر دربار آصفی میں انگریزی، فارسی، عربی تراجم و تعلیم کے انمول موتی لٹنے لگے۔ ذیل کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ مامون رشید اور یحیی اور خالد برمکی کی فیاضیاں حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم کی داد و دہش کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں اور اُن کی وہی حیثیت ہے جو ذرہ اور آفتاب کی ہے۔

(۱) دفتر مسجل	۱،۲۱،۶۵۷ روپیہ	(۱۰) گلبرگہ کالج۔	۳۴،۴۹۶
(۲) کلیہ جامعہ عثمانیہ	۷،۵۲،۹۲۹	(۱۱) دارالترجمہ	۲،۶۱،۴۱۵
(۳) کلیہ اناث	۳۳،۹۰۰	(۱۲) دارالطبع جامعہ عثمانیہ	۱،۵۰،۱۰۲
(۴) میڈیکل کالج	۱،۸۶،۰۸۲	(۱۳) رصدگاہ نظامیہ	۳۶،۱۶۴
(۵) ٹریننگ کالج	۲۵،۹۲۰	(۱۴) وظائف	۱،۳۵،۲۴۸
(۶) انجینیرنگ کالج	۲،۵۰،۰۰۵	(۱۵) محفوظ۔	۲۹،۸۱۵
(۷) سٹی کالج۔	۵۹،۷۱۵	(۱۶) بچت	۷،۳۱،۷۱۳
(۸) اورنگ آباد کالج	۵۳،۸۲۶	(۱۷) امدادی۔	۷،۶۵۷
(۹) ورنگل کالج	۳۳،۵۶۰		

جملہ ۲۹،۰۸،۱۸۶ روپیہ سکہ عثمانیہ سالانہ

۱۹۳۲ء تک دارالترجمہ میں ۳۵۸ کتابیں تیار ہوئیں جن میں سے تاریخ ہند پر ۴۹ تاریخ انگلستان و یورپ وغیرہ پر ۳۶ تاریخ اسلام پر ۲۶ جغرافیہ پر ۵ سیاسیات پر ۱۲ دستور انگلستان پر ۴ معاشیات پر ۱۳ عمرانیات پر ۲ فلسفہ پر ۱۶ منطق پر ۱ مابعد الطبیعیات پر ۲ نفسیات پر ۱۱ اخلاقیات پر ۱۱ ریاضیات پر ۲۲ طبعیات پر ۲۳ حیاتیات پر ۵ کیمیا پر ۸ الطب پر ۴۳۔ انجینیری پر ۴۰ اور مختلف موضوعوں پر ۴ کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ فن تعلیم پر ٹریننگ کالج اور نظامت تعلیمات کی جانب سے ایک درجن سے زیادہ تراجم شائع ہوئے ہیں جو

اپنی نوعیت کی اُردو دنیا میں واحد کتابیں ہیں اور ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہیں ...... یہ فہرست صرف اُن کتب کی تھی جو سرکاری طور پر شائع ہوئی ہیں، اگر اس میں ان تمام کتب کو شامل کر لیا جائے جو اس مُبارک ربع صدی کے دوران میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں تو ان کی تعداد چار ہزار سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔

متذکرہ صدر واقعات کے مطالعہ کے بعد ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ پر منکشف ہو گئی ہو گی کہ اعلیٰحضرت قدر قدرت میر عثمان علیخان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ کی ذات بابرکات کو اُردو سے کتنا شغف ہے اور وہ اس کی ترقی و اشاعت میں کتنی ممکنہ سعی فرماتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری اور اقتصادی پستی کے زمانہ میں بھی جبکہ ہر ملک کے مالیہ کا توازن بگڑ گیا ہے شاہ ذی جاہ بڑی سے بڑی منظوری دینے سے دریغ نہیں فرماتے۔ خوش قسمت ہیں اہل دکن کہ ان کو ایسا بیدار مغز، صاحب الرائے روشن خیال تاجدار ملا۔ خوش بخت ہے حیدرآباد کہ اسکو ایسا صاحب فطنت، دُور رس اور مدبر فرمانروا نصیب ہوا۔

حضرت بندگان عالی کی ذات گرامی دکن کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ہٹلر کی جرمنی کے لئے، سولینی کی اٹلی کے لئے، مصطفےٰ کمال کی ٹرکی کے لئے، رضا شاہ کی ایران کے لئے ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کی ساری زندگی ملک و تاج کے گم شدہ نگینوں کے حصول کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ خدا کرے کہ برار کی طرح خسرو ذی شان کی دیگر مساعی بھی مشکور ہوں اور جملہ نگینے زیب اکلیل شاہی ہوں۔

الٰہی رشتۂ عمر طویل آصف سابع
دراز از رشتۂ طوبیٰ محکم از حبل المتین باشد
فلک تا ہست بالائے زمین قائم ترا عثمان
ظفر در قبضہ و ملک جہاں زیر نگیں باشد
آمین

تعلیمات سلطنت آصفیہ
کی
ابتدائی تاریخ

مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب حیدرآبادی

عصر حاضر میں تاریخ نویسی کا اصلی مدعا کسی قوم یا ملک کے تمدنی یا تہذیبی پہلوؤں کی روشنی میں لانا قرار پایا ہے، مغربی قوموں نے اپنی تاریخ اس قالب میں پوری کامیابی سے ڈھال لی ہے، لیکن مشرقی ممالک کی قدیم کتابیں جن میں ان امور پر روشنی ڈالی گئی تھی ناپید ہو چکی ہیں، بعد کے زمانہ میں تاریخ زیادہ تر بادشاہوں کی ہنگامہ آرائیوں کے محور پر گھوم کر رہ گئی، اب جبکہ جدید مغربی خیالات سے متاثر ہو کر ہم اپنے ملک کے تمدن و تہذیب کے اصلی اور ابتدائی بنیادوں کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں تو راستہ کی تاریکی اور راہ کی صعوبت تھکا دیتی ہے۔

دکن کی گذشتہ حکومتوں کے زمانہ کو چھوڑ کر خود سلطنت آصفیہ کے عہد کو دیکھئے عام واقعاتی تاریخ خود اب تک مستند طریقہ سے نہیں لکھی جا سکی ہے، تمدنی اور تہذیبی تاریخ کا کیا ذکر، اس جانب توجہ کی بہت شدید ضرورت ہے، قدیم حالات سے واقف اصحاب جلد جلد اپنا دور ختم کرتے جاتے ہیں، ان کے ذاتی اور سینہ بسینہ چلے آنے والے حالات

پہ عجلت ممکنہ قلمبند نہ ہو جائیں تو ہماری تاریخ کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا، بہر حال اس تحریر کے ذریعہ اس قسم کی کوشش کی جانب قدم اٹھایا جا رہا ہے۔

ارشاد نبی صلعم "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" کے تحت ہر مسلم حکومت نے یہ کوشش کی کہ اس کی جانب سے نشر و اشاعت تعلیم کا بھی پورا حق ادا ہو، رعایا کو اس نعمت سے مستفید کرنے کے ذرائع پوری فراخ دلی سے کئے جاتے رہے۔ اسلامی ممالک میں خواہ وہ عربوں کی حکومت کے تحت ہوں یا ترکوں کے مغلوں کے تحت ہوں یا افغانوں کے، تعلیم کسی نہ کسی طریقہ سے رائج رہی، اور حکومت کی جانب سے اہل علم کی واجبی سرپرستی برابر ہوتی رہی۔

تاریخ کے صفحات پر صدہا اسلامی درسگاہوں کے نام سنہرے حروف میں نظر آتے ہیں ان کی صرف فہرست طویل صفحات کی متقاضی ہے۔ حجاز، عراق، مصر، اسپین، ایران، ہندوستان کے قطع نظر خود دکن میں بھی ایسی درسگاہیں قائم تھیں جو تشنگان علم کے لئے آب حیات بنی ہوئی تھیں۔ بیدر کا مدرسہ محمود گاوان جس کے کھنڈر اب تک اپنے بانی کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں، نہ صرف دکن کا بلکہ ہندوستان کا ایک عظیم الشان مدرسہ تھا، اس کے فیض سے دور دور تک کے طلبہ مستفید ہوتے تھے، مدتوں تک یہ مدرسہ ہندو دکن اور عرب و عجم کے طلبہ کا سنگم بنا رہا۔

سلاطین قطب شاہی کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی ان کے کئی حکمراں نہ صرف خود زیور علم سے آراستہ تھے بلکہ ان کو اپنی رعایا کی علمی ترقی کا بھی بڑا خیال دامن گیر تھا، اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سلطان ابراہیم کے زمانہ میں بیسیوں مدرسے تعمیر ہوئے تھے۔[1]

سلطان ابراہیم کا جانشین محمد قلی قطب شاہ نے بھی علم و فن کی سرپرستی کے لحاظ سے زندگی جاوید حاصل کی ہے، سلطان کی داد و دہش اور قدردانی علم و فن کا شہرہ سنکر عرب عجم سے علماء و فضلاء شعرا اور ادیب دربار میں آتے اور بادشاہ کی فیاضی سے بہرہ اندوز ہوتے تھے، اس کے زمانہ میں بھی کثرت سے مدرسے تیار ہوئے، اسی نے شہر حیدر آباد کو

[1] تاریخ قطب شاہی مخطوطہ انڈیا آفس ص ۳۶ و ۱۰۷

آباد کیا، جامع مسجد بنائی تو مسجد کے ساتھ مدرسہ اور طلبہ کے رہنے کے لئے حجرے بھی بنائے
چار مینار بھی دراصل ایک مدرسہ ہی تھا جو اسی سلطان کی یادگار ہے[1]،

سلطان محمد قلی کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا نام مکہ مسجد کے تہجد گزار بانی کی
حیثیت سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتا،

سلطان محمد کو علم و فن سے بھی گہری دلچسپی تھی اس کا دربار بالاکثر ایک علمی مجلس کی صورت
میں بدل جایا کرتا تھا، جہاں علوم عقلی و نقلی پر بحث و مباحثہ ہوتا، اور خود سلطان کی بحث
وتنقید ہر طرف سے خراج تحسین حاصل کرتی، ایسے علم دوست اور ادب پرور سلطان نے
علم و فن کی ترویج کے لئے کیا کیا نہ کیا ہوگا جس کی صراحت موجب طوالت ہے،

سلطان محمد کا جانشین عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح قدردانی
کے روایات برابر قائم رکھے، برہان قاطع لغت اس کے نام پر معنون ہوا ہے، سلطان
عبداللہ کے زمانہ میں خود امراء و ارکان سلطنت نے بھی بذات خود درس و تدریس کا سلسلہ
قائم رکھا تھا، چنانچہ نواب علامی جو میر جملہ گی کی خدمت سے سرفراز تھے، خود درس دیا کرتے
اس کے متعلق مولف حدیقۃ السلاطین نے لکھا کہ نواب علامی نے باوجود کثرت کار اور
مشاغل مہمات سلطنت ہر روز صبح درس دینے کا شغل جاری رکھا تھا، علماء و فضلا شعرا اور
طالبان علم کثرت سے جمع ہوتے علوم منقول تفسیر، حدیث فقہ کے ساتھ حکمت اور ریاضی
و منطق کا درس ہوتا تھا۔

دکن میں قطب شاہی سلطنت کے بعد مغلیہ دور میں بھی تعلیمات کی جانب برابر توجہ رہی،
مدرسہ محمود گاوان کے دروازے تشنہ گان علم کے لئے کھلے ہوئے تھے، مولانا محمد حسین الملقب
بہ امام المدرسین آخری صدر مدرسہ تھے، بجلی کے گرنے سے عمارت مدرسہ جب منہدم ہوئی انہوں نے
اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی[2]

(۱)

سلطنت آصفیہ کی بنیاد ۱۱۳۲ھ میں رکھی گئی، حضرت آصف جاہ اول نے زمام حکومت

---

[1] تاریخ قطب شاہی مخطوطہ انڈیا آفس ۱۳۳۷ء۔ [2] تاریخ احمدی مخطوطہ، خافی خاں۔

ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی جہاں سلطنت وحکومت کو مستحکم کرنے کے تدابیر عمل میں لائے وہاں دیگر انتظامات سے قطع نظر تعلیمات کی جانب بھی پوری توجہ مبذول کی۔

واضح ہو کہ سلطنت آصفیہ میں نشر و اشاعت تعلیم کے لئے جو ادارے قائم ہوئے ان کی نوعیت دو طرح کی تھی، ایک وہ مدرسے جو سرکاری طور پر قائم تھے اور ان مدارس کے اخراجات شاہی خزانہ سے ادا ہوتے تھے، ان مدارس کی اعلیٰ نگرانی صدر الصدور کے سپرد تھی، ان مدارس کے مدرسین کا تقرر اعلیٰحضرت یا دیوان وقت کی منظوری کا محتاج تھا،

دوسرے وہ مدرسے جو امرار ملک وغیرہ کے قائم کردہ تھے، جس کے اخراجات کا بار خود ہی امرا اٹھایا کرتے تھے۔

ان مدارس کے علاوہ علمار وفضلار حافظ قران، خوش نویس وغیرہ علیحدہ تھے، جو اپنی طور پر درس دیا کرتے تھے، طالبان علم اور شائقین فن ان کے مکانوں اور مسجدوں اور خانقاہوں میں ان کے فیض سے فیضیاب ہوتے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو سرکار سے امداد یومئے اور روزینے مقرر تھے، تاکہ یہ لوگ فکر معاش سے مستغنی ہو کر اپنی علمی خدمت کی بجاآوری میں مصروف رہیں۔

اس موقع پر جن مدارس کا پتہ چلتا ہے ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

(۱) دفتر دیوانی و مال سرکار عالی کے کاغذات سے ثابت ہے کہ مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد میں ایک مدرسہ تھا جس کا قیام ۱۱۲۵ھ کے پہلے مغلیہ عہد میں ہوا تھا۔ اور ایک بڑی جاگیر مدرسہ کے اخراجات کے لئے دی گئی تھی، سلطنت آصفیہ کے ابتدائی عہد میں یہ مدرسہ بدستور قائم رہا اور اس کے اخراجات کی جاگیر بحال تھی، اس مدرسہ کے صدر شیخ السلام خاں تھے، ایک زمانہ دراز تک یہ مدرسہ قائم تھا، اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔[1]

(۲) مدرسہ فاروقیہ کے نام سے حضرت آصف جاہ نے اورنگ آباد میں ایک جدید مدرسہ قائم کیا، اس کا قیام کس سنہ میں ہوا، اس سے ہم واقف نہیں ہیں مگر یہ مدرسہ عرصہ دراز

[1] کاغذات دفتر دیوانی و مال۔

تک قائم رہا اور اس مرکز علم و فن سے بیسیوں تشنگان علم نے فیض پایا ہے[1]۔

(۳) مدرسہ حیدرآباد، اس مدرسہ کی ابتدا بھی حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں ہوئی، سنہ ۱۱۵۶ھ مطابق سنہ ۱۷۴۲ء میں اس کا قائم ہونا ممکن ہے، سنہ ۱۲۱۱ھ کے بعد بھی یہ مدرسہ قائم رہا اس کے دو مدرس تھے، جو مدرس اول اور دوم کے لقب سے موسوم تھے، مدرس اول کو (سنہ) ماہوار اور مدرس دوم کو (عنہ) ماہوار ملا کرتی تھی،

اگرچہ یہ ماہوار آج کل کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس زمانہ کے معیار زر کے لحاظ سے آج کل کے چار پانچ سو سے کم نہیں تھی،

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ مدرسہ صدر الصدور کی نگرانی میں تھا، مگر مدرسین کے تقرر و تبدل کا ان کو اختیار نہیں تھا، بلکہ خود اعلیٰ حضرت یا دیوان کی منظوری ضروری تھی، اس کے محل وقوع اور نیز دوسرے ضروری امور کا کوئی علم ہمیں نہیں ہے، اس مدرسہ کے جن مدرسین کے نام ہم کو معلوم ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مولوی قطب عالم، آپ مدرسہ حیدرآباد کے پہلے مدرس تھے، مدرس اول کی خدمت پر مامور تھے، سنہ ۱۱۶۵ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

(۲) مولوی حافظ عبد الغفور، سید قطب عالم کے مرنے پر آپ کا تقرر نواب صلابت جنگ نے فرمایا تھا، سنہ ۱۱۷۹ھ تک یہ اپنی خدمت پر مامور تھے۔

(۳) حافظ عبد الغفور کے بعد ان کے لڑکے میر قدرت اللہ سنہ ۱۱۷۹ھ میں مامور ہوئے

(۴ تا ۶) پھر مولوی محمد سلیم کا تقرر سنہ ۱۱۹۹ھ میں آصف جاہ ثانی نے فرمایا ان کے بعد محمد یوسف مامور ہوئے۔ محمد یوسف نے منصب قضا پر ترقی پائی تو سید محمد کا تقرر عمل میں آیا۔

(۷) ملا فرخ مدرسہ حیدرآباد کے مدرس دوم تھے، سنہ ۱۱۵۶ھ میں ان کا تقرر ہوا تھا۔

(۸ تا ۱۲) ملا فرخ کے بعد محمد وارث، ان کے بعد حافظ محمد مخاطب بہ شریعت اللہ خاں سنہ ۱۱۷۱ھ میں مامور ہوئے، ان کے بعد مولوی چراغ علی اور پھر ان کے بعد ان کے لڑکے محمد تقی کا تقرر ہوا مگر انہوں نے جائزہ نہیں لیا اس لئے مولوی محمد برہان سنہ ۱۲۱۱ھ میں مامور ہوئے[2]۔

---

[1] تاریخ دار العلوم مرتبہ مولوی مرتضیٰ مرحوم۔ [2] کاغذات دفتر دیوانی و مال۔

(۴) حضرت آصف جاہ ثانی (۱۱۷۵ھ، ۱۲۱۸ھ) کے زمانہ میں مختلف اضلاع اور قصبات کے بعض چھوٹے مدرسوں کا پتہ چلتا ہے، جہاں ایک ایک مدرس درس دیا کرتا اور سرکار سے اس کے نام یومیہ کی اجرائی ہوتی تھی، اسی قسم کے کئی مدارس تھے۔[۱]

(۵) مدرسہ حسینیہ، ضلع میدک میں ٹیکمال ایک قدیم قصبہ ہے، جو زمانہ سابق میں ٹیک محل سے موسوم تھا، یہاں مدرسہ حسینیہ ۱۲۴۲ھ میں قائم ہوا تھا، اس کے بانی سید صاحب حسینی بادشاہ قادری تھے۔

سید صاحب حسینی نے اپنی وفات تک جو ۱۲۹۰ھ میں ہوئی اس مدرسہ کو قائم رکھا تھا، ان کے بعد بھی ان کے فرزند کی زندگی میں یہ مدرسہ موجود تھا، ۱۳۲۵ھ میں ان کے انتقال پر مدرسہ بند ہوگیا۔

سید صاحب حسینی کے والد سید شاہ عبدالرزاق قادری تھے، یہ ایک متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، ان کو حضرت سید محمد معروف شاہ اللہ قدس سرہ سے نہ صرف بیعت حاصل تھی بلکہ ان کے خلیفہ بھی تھے، شاہ معروف ایک صاحب باطن مقدس بزرگ تھے، جنہوں نے ٹیکمال میں اقامت کر لی تھی، تبلیغ دین اسلام آپ کا رہا شغلہ تھا، ٹیکمال ہی میں آپ کا وصال ہوا، یہاں ہی مدفون ہیں، آج بھی آپ کی درگاہ مرجع خاص و عام ہے۔

سید صاحب حسینی کی پیدائش ۱۲۱۹ھ میں ہوئی، حیدرآباد میں انہوں نے تعلیم کی تکمیل کی ۱۲۳۵ھ میں اپنے وطن ٹیکمال کو واپس ہوئے مسلمانوں کی عام علمی پستی خصوصاً دینیات سے بے خبری کے باعث آپ نے مدرسہ حسینیہ قائم کیا تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کی اصلاح ہو اور اس کے ساتھ دینوی تعلیم بھی ہوتی رہے، چنانچہ اس وقت کی عام علمی حالت کے متعلق صاحب حسینی کے حسب ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں!

"فی زمانہ در امصار این دیار مرض لاعلمی جوارح و اعصاب قالب شرافت را آں چناں معذور و مفلوج کردہ کہ نیز تا چندے بجانب اصلاح و تدابیر آں اگر توجہی مبذول کردہ نشود خوف است کہ در اندک زمانہ وجود علم و نام

---

[۱] کاغذات دفتر دیوانی۔

انسانیت از صفحۂ گیتی محو گردد۔"

چنانچہ مدرسہ حسینیہ میں نہ صرف مذہبی دینی تعلیم ہوتی تھی بلکہ اس وقت کے ضروریات کے موافق دنیوی تعلیم کا بھی معقول انتظام تھا، مدرسہ کے ساتھ دارالاقامہ بھی تھا اس لئے تربیت کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا۔

ایک زمانہ دراز تک حیدرآباد اور اضلاع کے دفاتر کے لئے عہدہ دار اور اہلکار کی دستیابی اسی مدرسہ کے ذریعہ ہوتی رہی چنانچہ نواب مختار الملک اول کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں:۔

"دریں تحفۃ الرجال ایں قدر مردم باکمال از یک قصبہ بہم رسیدن موجب خوشنودی کمال است، وجود فیض آمود جناب باعث افتخار ملک و ممنونی سرکار است۔"

اس مدرسہ کے بعض مشاہیر طلبہ حسب ذیل ہیں:۔

مولوی محمد صدیق المخاطب صدیق یار جنگ (معتمد پیشی نواب مختار الملک) حسن بن عبداللہ المخاطب عماد نواز جنگ (صدر محاسب) وحید منور خاں مشہور الملک (معتمد صرف خاص) مقتدر جنگ، قادر نواز جنگ، مولوی یوسف الدین مرحوم سابق صوبہ دار وغیرہم۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آخر الذکر تینوں اصحاب دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد تربیت کے لئے سید صاحب حسینی کے مدرسہ کو روانہ کئے گئے تھے۔

اس مدرسہ میں نہ صرف حیدرآباد کے طلبہ تعلیم پاتے تھے بلکہ قلمرو آصفی کے باہر سے بھی طلبہ آتے اور سید صاحب حسینی کے فیض سے مستفید ہوتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے قیام کا بھی انتظام تھا، خورد و نوشش وغیرہ کا بار سید صاحب حسینی ہی برداشت کرتے تھے، اگر اس کے باوجود سید صاحب حسینی نے سرکار سے کوئی امداد نہیں لی، جملہ اخراجات خود خرچ کرتے تھے وہ خود ہی مدرسہ کے پرنسپل خود ہی مدرس اور خود ہی مودب و مہتمم تھے۔

صاحب حسینی کے فرزند سید احمد بادشاہ کے انتقال پر جو ۱۳۲۵ھ میں ہوئی مدرسہ حسینیہ

برخاست ہوگیا[۱]

(۶) مدرسہ شجاعیہ، یہ وہی مدرسہ ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں جامعہ مسجد حیدرآباد میں قائم ہوا تھا، آصفی عہد میں ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء سے یہ مدرسہ اپنے روح رواں مولانا حافظ شجاع الدین کے نام پر مدرسہ شجاعیہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

مولانا شجاع الدین کے اجداد اکبری عہد میں ہندوستان آئے، آپ کے والد مولوی میر کریم اللہ خاں نے برہان پور میں اقامت اختیار کی اور یہاں کے سادات میں جو خواجہ ہاشم قدس اللہ سرہٗ کی اولاد سے تھے بیاہ کیا۔ ۱۱۸۰ھ میں مولوی شجاع الدین کی پیدائش ہوئی، آپ کی ولادت کے ایک سال بعد آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔

مولوی شجاع الدین نے برہان پور ہی میں اقامت اختیار کی اور علم کی تکمیل کی اس زمانہ میں برہان پور علماء و فضلاء کا مرکز تھا اس لئے مولانا کو کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی، چھتیس سال کی عمر میں آپ حج و زیارت سے فارغ ہو کر ۱۲۱۶ھ میں حیدرآباد آئے، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری رح سے بیعت تھی اور خلافت بھی حاصل ہوئی تھی۔

مولانا شجاع الدین نے پہلے پہل جامع مسجد کے مدرسہ کے ایک کمرہ میں اقامت اختیار کی اور طلبہ کو درس دینے لگے، اس زمانہ میں اس مدرسہ کی حالت نہایت ابتر تھی، مدرسہ کے صحن میں مغل صاحب ایک جاگیردار کے ہاتھی باندھے جاتے، ان کے دانے چارہ کا ذخیرہ مدرسہ کے حجروں میں رہتا تھا۔

مولانا کے علم و فضل کا جب حیدرآباد میں شہرہ ہوا اور اہل شہر آپ کے علمی فیض سے بہرہ اندوز ہونے لگے تو نواب شمس الامراء ثانی کو بھی آپ سے عقیدت ہوگئی، آپ مہاراجہ چندولال کے ساتھ مولانا سے ملنے گئے، مدرسہ کی حالت دیکھی تو جاگیردار صاحب کو فوراً صفائی کا حکم دیا، خود شمس الامراء نے اپنے صرفے سے مولانا اور طلبہ کے لئے کمرے درست کردئے (۱۲۴۵ھ ۱۸۳۰ء) اس کے بعد مدرسہ کی خوب شہرت ہوئی اطراف اور

[۱] اس مدرسہ کے حالات فرہنگ حسینی اور مولوی ابوالحسن صاحب قیصر سے معلوم کئے گئے ہیں۔

اکناف سے تشنگان علم آتے اور مولانا سے فیضیاب ہوتے تھے۔[۱]

(۷) انگریزی مشن کا مدرسہ، ۱۸۳۵ء میں انگریزی مشن کی جانب سے ایک مدرسہ قائم ہوا، جو آج بھی سینٹ جورجز گرامر اسکول کے نام سے موسوم ہے، اس مدرسہ میں ابتدأً اردو اور انگریزی تعلیم ہوتی تھی، رزیڈنسی میں یہ مدرسہ قائم ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد موجودہ عمارت میں منتقل ہوا، عمارت کی توسیع زمانہ مابعد میں ہوئی۔

(۸) مدرسہ فخریہ۔ مدرسہ فخریہ کا قیام ۱۲۵۵ھ م ۱۸۴۳ء میں ہوا، اس مدرسہ کے بانی نواب فخر الدین خاں امیر کبیر شمس الامرا ثانی ہیں۔

شمس الامرا کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خاں عالمگیری امرا میں شامل تھے، حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں نمایاں خدمات انجام دیکر منصب چار ہزار اور دو ہزار سوار پر فائز ہوئے، ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانہ میں اپنے وفاشعارانہ خدمات کے صلہ میں امام جنگ کے خطاب سے سربلند ہوئے، ۱۱۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا،

ابوالخیر خاں کے فرزند ابوالفتح خاں تھے، ان کو ابوالخیر خاں تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الامرا کا خطاب ملا تھا، سرکار نے لاکھوں کی جاگیر بھی عنایت کی جاگیر کا مقصد فوج کی فراہمی تھی، چنانچہ آپ اپنی تربیت یافتہ فوج کے ساتھ تخت و تاج کی خدمت گزاری میں ہمیشہ مصروف رہے، فوج جمعیت پائیگاہ کے نام سے موسوم ہوئی، ۱۱۲۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کے فرزند محمد فخر الدین تیغ جنگ شمس الامرا ثانی امیر کبیر اول ہیں، آپ کی پیدائش ۱۱۹۴ھ میں بمقام برھان پور ہوئی، باپ کے انتقال کے وقت گیارہ سال کی عمر تھی، اس وقت سے نوازشات شاہی مبذول ہوتے رہے، حتیٰ کہ دامادی کے اعزاز سے بھی نوازا گیا، لاکھوں کی نئی جاگیر ذات اور جمعیت کے لئے عطا ہوئی، ۱۲۰۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا، درگاہ برہنہ شاہ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔

شمس الامرا ثانی بڑے ذی علم اور علم دوست تھے، بیسیوں ارباب علم اور

---

[۱] مناقب شجاعیہ، اور حیدرآباد کی گذشتہ تعلیم مرتبہ سروری صاحب۔

اصحاب دانش وظیفہ خوار تھے، شعرا، ادیب علما اور فضلاء کے لئے شمس الامرا کی ذات ایک اصلی مربی اور حقیقی سرپرست کی حیثیت رکھتی تھی، مصنفین اور مولفین کو ان کی محنت کا صلہ دینے میں پوری دریا دلی برتی جاتی تھی۔

شمس الامرا کا مہتم بالشان کارنامہ جو تاریخ زبان اُردو میں آب زر سے لکھا جائیگا یہ ہے کہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۶ء) میں انہوں نے مغربی علوم وفنون یعنی کیمیا، طبعیات، ریاضی اور ہیئت کی کتابوں کو انگریزی اور فرانسیسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کرانے کا سلسلہ قائم کیا، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کہیں اور اس قسم کے کام کی ابتدا ہوئی تھی، ارباب کمپنی نے کلکتہ میں اردو و نثر کی ترویج میں قصہ کہانیاں یا تاریخ کی کتابیں ترجمہ کرائیں یہ کارنامہ اس زمانہ میں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن شمس الامرا نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں اور اس کی بدولت زبان اردو میں جو اضافہ ہوا وہ ان قصہ کہانیوں سے کہیں زیادہ برتر اور بلند تر ہے۔

شمس الامرا نے کئی مدرسے قائم کئے تھے، ان میں سے ایک مدرسہ فخریہ ہے، جو آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے قائم ہوا تھا، اس مدرسہ کے مدرسین کی ماہوار بیش قرار تھی، طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے تھے، اور ان کے دوسرے تعلیمی مصارف بھی شمس الامرا خود اپنی ذات سے ادا کرتے تھے، علوم عقلی اور نقلی کی تعلیم ہوتی تھی، صدہا طلبہ نے فارغ ہوکر دستار فضیلت باندھی۔

اس مدرسہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں مغربی علوم کی ترجمہ شدہ کتابیں بھی درس میں شامل تھیں جو تمام طلبہ کو مفت دی جاتی تھیں، اس طرح یہاں کے طلبہ نہ صرف حدیث فقہ، صرف ونحو، وغیرہ کے ماہر ہوتے بلکہ کیمیا، طبعیات، ریاضی اور ہیئت کے جدید مغربی مسائل سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اس طرح آج سے ایک صدی پیشتر یہاں کے طلبہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم اُردو زبان میں حاصل کرتے تھے، گویا جامعہ عثمانیہ کا نقش اول تھا۔

شمس الامرا کے بعد اس مدرسہ کی حالت میں بہت زوال آگیا اس وقت یہ مدرسہ تحتانیہ مدرسہ کی صورت میں موجود ہے، نواب معین الدولہ بہادر کی پائیگاہ اخراجات کی

کفیل ہے۔[1]

(۹) ۱۲۵۸ھ سنہ میں شمس الامراء نے مدرسہ فخریہ کے علاوہ کئی اور مدرسے بھی قائم کئے، ان کی حیثیت ابتدائی نوعیت کے مدارس کی تھی، ایک بڑا مدرسہ تھا اس میں ۱۲۸۰ھ سنہ میں (۴۲۸) طلبہ شریک تھے، یہ مدرسہ سید عبدالرزاق کی نگرانی میں تھا جو فتح الدولہ کے رشتہ دار تھے، اس مدرسہ کے لئے ایک خاص کتب خانہ بھی قائم تھا کتب خانہ دار محمد جعفر نام کوئی صاحب تھے[1]

(۱۰) مدرسۂ طبیہ[2] ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء سنہ میں مدرسہ طبیہ قائم ہوا، اس کے قائم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ اعلیٰحضرت ناصرالدولہ آصف جاہ رابع کا مزاج ناساز ہوا، یونانی اطباء کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا، رزیڈنٹ مسٹر فریزر سے گفتگو ہوئی تو اُنھوں نے انگریزی علاج کی جانب توجہ دلائی، حضور نے اس شرط پر ڈاکٹری علاج سے رضامندی ظاہر کی کہ کسی دوا کا استعمال نہ کرایا جائے،

رزیڈنسی کے سرجن میکلین نے معائنہ کے بعد غذا کے ذریعہ علاج شروع کیا، تین ماہ میں اعلیٰحضرت کو صحت حاصل ہوگئی، اس پر مسرت کا اظہار کیا گیا اور حیدرآباد میں مدرسہ طبابت قائم کرنے کا حکم دیا۔

اس حکم کی بناء پر مدرسہ طبی قائم ہوا اور اردو زبان میں ڈاکٹری کی تعلیم ہونے لگی، ۱۸۹۳ء سنہ تک اُردو میں تعلیم ہوتی تھی، سنہ مذکور سے بجائے اُردو کے انگریزی میں تعلیم ہونے لگی، اور اب جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس مدرسہ کو ضم کر دیا گیا اور پھر سے اُردو میں تعلیم ہونے لگی ہے،

ایک زمانہ دراز تک حیدرآباد اور اضلاع میں وہی ڈاکٹر مامور تھے جنھوں نے یہاں کے مدرسہ طبی میں اُردو زبان میں تعلیم حاصل کی تھی اس موقع پر بعض نام آور طلبہ کی صراحت بے محل نہیں ہوسکتی۔

(۱) ڈاکٹر وزیر علی، سلطان الحکماء کا خطاب ملا، اور ناظم طبابت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

---

[1] تاریخ رشید الدین خانی، دکن میں اُردو، [2] تاریخ رشید الدین خانی، [3] بستان آصفی اور گزٹیر سرکار عالی۔

(۲) ڈاکٹر مرزا علی، حکیم الحکمار کا خطاب ملا تھا اور ناظم طبابت تک ترقی کی تھی
(۳) ڈاکٹر محمد حیدر، المخاطب اشرف الحکمار لقمان الدولہ مرحوم، جو مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کے خاص ڈاکٹر اور اسٹاف سرجن تھے۔
(۴) ڈاکٹر عبدالحسین المخاطب نواب ارسطو یار جنگ بہادر جو بفضلہ اب تک زندہ ہیں اور تاحال اُردو میں نسخے لکھا کرتے ہیں، جن کی بے نظیر جرّاحی کا بڑے بڑے سرجنوں نے اعتراف کیا ہے۔
(۵) ڈاکٹر سید احمد مرحوم، جو ایک عرصہ دراز تک حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر تھے مسٹر سید اعظم پرنسپل سٹی کالج آپ ہی کے قابل فرزند ہیں۔

(۱۱) مدرسہ دارالعلوم مدرسہ دارالعلوم کا افتتاح، ۲۰ رجب ۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۶ء میں ہوا، چند سال کے عرصہ میں اس مدرسے نے خاصی ترقی حاصل کرلی، اس زمانہ میں یہاں نہ صرف عربی اور فارسی کی تعلیم ہوتی تھی بلکہ انگریزی، تلنگی اور مرہٹی کے درس کا انتظام بھی تھا اور تعلیم المعلمین کا کام بھی اس مدرسہ سے لیا جاتا تھا؛
ایک خاص کمیٹی کے سپرد اس مدرسہ کی نگرانی وغیرہ تھی، جس کے ارکان معتمدالدولہ شیخ علی منصبدار، جمشید جی اور مسٹر براؤن تھے، کچھ عرصہ کے بعد انگریزی شاخ اس مدرسہ سے علٰحدہ ہوگئی اور سٹی ہائی اسکول کی بنیاد قائم ہوئی۔
مدرسہ دارالعلوم کے چار دور قائم کئے جاسکتے ہیں:
(۱) پہلا دور ابتدائی قیام سے پنجاب یونیورسٹی سے تعلق ہونے تک یعنی ۱۲۷۲ھ تا ۱۳۰۲ھ، اس زمانہ میں درس نظامیہ کی تعلیم ہوتی تھی، حیدرآباد کی بڑی بڑی ہستیوں نے اس زمانہ میں استفادہ کیا، چونکہ یہی پہلا سرکاری مدرسہ تھا جو نواب مختار الملک بہادر نے قائم کیا تھا اس لئے اس کی ترقی اور انتظام کا بڑا خیال تھا؛
اس زمانہ میں جن اصحاب نے استفادہ کیا تھا ان میں سے بعض لوگوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔
نواب آصف یاور الملک وزیر علی بادشاہ، نواب مکرم الدولہ، نواب سہراب جنگ

رفعت یار جنگ اول عماد جنگ اول معتمد جنگ، معین یار الدولہ، مقتدر الدولہ، قادر نواز جنگ، محمد نواز جنگ، لطیف یار جنگ، مولوی یوسف الدین، ملا عبدالقیوم، مرزا محمد علی خاں، مرزا مہدی خاں، مولانا عبدالحی مرحوم۔ شیخ چراغ علی فرنگی محل لکھنو وغیرہم۔

(۲) دوسرا دور ۱۳۰۸ھ سے ۱۳۲۴ھ تک جبکہ اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے رہا، منشی، منشی عالم، منشی فاضل، مولوی، - مولوی عالم، اور مولوی فاضل کی تحصیل ہوتی رہی، اور صدہا طلبہ فارغ التحصیل ہو کر ملک اور مالک کی خدمت میں مصروف ہوئے دارالعلوم کے طلبہ اکثر و بیشتر پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ میں اول آتے رہے،۔

اس دور کے بعض طلبہ کے اسماء کی صراحت بھی بے موقع نہیں ہو سکتی، جو یہ ہیں نواب اظہر جنگ نواب صدیق یار جنگ مولوی عبدالقدیر، مولوی سید غلام نبی، مولوی سید جمال الدین نوری مرحوم، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم، مولوی محمد اکبر علی، ملا عبدالباسط، احمد اللہ بیچ سی بیس، حضرت امجد، کیفی، ذہین، خواجہ فیاض الدین، مرزا محمد بیگ، فیض الدین کمیل وغیرہم۔

(۳) دارالعلوم کا تیسرا دور پنجاب یونیورسٹی، کا تعلق منقطع ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے (۱۳۲۴ھ) اس زمانہ میں دارالعلوم کی کشتی قریب تھا کہ ڈوب جائے مگر مرحوم عزیز مرزا، اور ڈاکٹر نواب سراج یار جنگ کی توجہ سے مدرسے نے سنبھالا لیا، جدید تنظیم کے لئے، مولانا شبلی نعمانی کو بلایا گیا، نصاب میں ترمیم ہوئی، ڈاکٹر الماللطیفی سر مسعود جنگ کی نظامت اور آنریبل نواب سر حید ر نواز جنگ کی معتمدی کے زمانہ میں جدید اسکیم مرتب اور نافذ ہوئی، علامہ شبلی مرحوم کے بھائی مولانا حمید الدین بی۔اے مرحوم اس کی صدارت کے لئے طلب کئے گئے۔ تا آنکہ وہ زمانہ آیا جبکہ دارالعلوم نے جامعہ عثمانیہ کا جنم لیا، یا یوں کہ دارالعلوم جامعہ عثمانیہ میں ضم ہو گیا، (۱۳۳۷ھ) اور دارالعلوم کا نام صرف فوقانیہ مدرسہ کی حد تک باقی رہ گیا۔ یہ اس کا چوتھا دور ہے۔

دارالعلوم کے تیسرے دور میں بھی کئی نامور طلبہ اس کے بوسیدہ مگر پر عظمت اور تاریخی عمارت سے فارغ التحصیل ہو کر ملک کی خدمت بجا لا رہے ہیں جن میں سے

بعض حسب ذیل ہیں:۔

احمد عبداللہ پروفیسر نظام کالج، حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر ظہیر الدین پروفیسران جامعہ عثمانیہ حضرت صابر حسینی، مولانا حسام الدین فاضل، وغیرہم

۱۲۔ مدرسہ انجینیرنگ [۱] مدرسہ دارالعلوم کے بعد سرکار نے ایک مدرسہ انجیزی کی تعلیم کے لئے قائم کیا، ابتداً ورنگل میں اس کو قائم کیا گیا بعد میں حیدرآباد منتقل کیا گیا؛

۱۳۔ اضلاع کے مدرسے مدرسہ دارالعلوم کے قائم ہونے کے پانچ سال بعد ۱۸۵۹ء میں احکام جاری کئے گئے کہ ہر تعلقہ میں ایک فارسی مدرسہ اور ایک ملکی زبان کا مدرسہ قائم کیا جائے، اس کے انتظام کے لئے ایک مجلس ہر تعلقہ میں ہوتی تھی، جس کے میر مجلس تحصیلدار اور ارکان پٹیل پٹواری ہوتے تھے، سوم تعلقدار کے ذمہ نظارت کے فرائض سپرد تھے، ۱۸۶۸ء میں تعلیمات کا کام مال گذاری سے علحدہ ہوا، اور صدرالمہام متفرقات سے اس کا تعلق قائم کیا گیا۔

مرزا موسیٰ خاں کی حیثیت گویا ناظم تعلیمات کی، مرزا موسیٰ خاں صاحب مرحوم مرزا حسین علی خاں صاحب نائب صدر جامعہ عثمانیہ کے دادا تھے،

موضوع مضمون کے لحاظ سے ہمارا تذکرہ یہاں ختم ہوجاتا ہے، ۱۸۶۸ء کے بعد جدید انتظامات عمل میں آئے اور تعلیمات کا قالب ہی بدل گیا، اس کی صراحت طویل صفحات کی متقاضی ہے!

(۲)

اب ہم بعض ان علماء کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دئیے ہیں ان میں سے بعض تو مذکورہ مدارس میں تعلیم دیا کرتے تھے، جن کا ذکر کردیا گیا ہے۔ یہاں صرف ان علماء کو متعارف کرایا جاتا ہے جن کے مکانات ہی مدارس اور مکاتب کی حیثیت رکھتے تھے،

سلطنت آصفیہ کی جانب سے اکثر ایسے علماء، حفاظ، مقری، خوشنویس وغیرہ کو

[۱] دارالسلام کے حالات ہم نے اپنے زیر ترتیب کتاب سے انتخاب کئے ہیں جو "دارالعلوم" کے نام سے مرتب کیگئی ہے۔ ٹمٹ۔ گزیٹر، مرتبہ مرزا مہدی خاں۔

یومیے اور منصب مقرر تھی، اسلامی علمار کے ساتھ ساتھ پنڈتوں، شاستریوں، مہنوں وغیرہ کے نام بھی معاش جاری تھی، ان سب کے فرائض یہی تھے کہ علم کی خدمت گزاری کیجائے اور شائقین علم کو بغیر کسی فیس وغیرہ کے مفت تعلیم دیا کریں۔

اس قسم کے بیسیوں نام ہم کو معلوم ہیں جو درس قرآن، دینیات، ادبیات، خوشنویسی وغیرہ اور تعلیم سنسکرت، نجوم وغیرہ کے لئے وظائف پاتے تھے، نہ صرف مردوں کے نام ہی دستیاب ہوتے ہیں بلکہ بعض خواتین کے نام بھی ملتے ہیں[۹]۔

علما، اور فضلا، پنڈتوں شاستریوں کے ساتھ ساتھ طلبہ کو بھی وظائف "یومیے" کے نام سے ملا کرتے تھے، اور اکثر و بیشتر ایسے وظائف زمانہ طالب علمی کے بعد ملا کرتے، بلکہ بعض تو دوامی ہو کر ان کی اولاد اور متعلقین بھی اس سے مستفید ہوئے ہیں، جس طرح درس و تدریس کے وظائف میں مذہب کی تخصیص نہیں تھی اسی طرح طلبہ میں بھی کوئی فرق مذہب و ملت نہیں تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے بہ نسبت ہندوں کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے[۱۰]۔

اگرچہ آج کل کے لحاظ سے اس وقت کے یومیے جو طلبہ وغیرہ کو دیے جاتے تھے حقیر معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ کم از کم یومیہ دو آنے دیا گیا ہے، مگر یہ وظائف اس زمانہ کی معاشرت، جنس کی ارزانی کے لحاظ سے کافی سے زیادہ تھے، اس کے علاوہ طلبہ کو مدرسہ کی کوئی فیس ادا کرنی نہیں ہوتی تھی، امتحان کی شرکت کے اخراجات نہیں تھے، کتابوں نوٹ بکوں وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی، جن کتابوں کا درس ہوتا تھا وہ اکثر و بیشتر طلبہ خود نقل کر لیتے یا مدرسہ کے کتب خانہ سے حاصل کر لی جاتی، ان وجوہ سے آج کل کی بہ نسبت زمانہ سابق کے طلبہ اچھی حالت میں ہوتے تھے۔

بعض علما، ایسے بھی تھے جو طالب علم کے روزمرہ اخراجات اور ان کے خورد نوش کے مصارف بھی خود اپنی ذات سے ادا کرتے تھے، ان کا مکان ہی گویا دارالاقامہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

۹و۱۰۔ کاغذات دفتر دیوانی و مال۔

ایسے علماء جو درس اور تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے بیسیوں ہیں۔ ان میں سے چند کا تعارف کرایا جاتا ہے:۔

(۱) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، ۱۱۱۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، ۱۱۵۶ھ میں آپ نے اورنگ آباد سے آکر یہاں اقامت اختیار کر لی، نواب ناصر جنگ کے دربار میں باریاب تھے، آپ کی قابلیت کا شہرہ نہ صرف دکن یا ہندوستان میں تھا، بلکہ حجاز، ایران اور مصر میں بھی آپ کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

آپ شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے آپ کی مجلس میں ہر وقت مباحثہ، مناظرہ اور مذاکرہ کا چرچا رہا کرتا، شعر و سخن کی اصلاح کا سلسلہ بھی جاری تھا، آپ کے حلقۂ درس میں عرب و عجم کے طلبہ شامل ہوتے تھے، آپ کے کئی شاگرد مشہور ہیں، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔

مولانا عبدالوہاب افتخار تخلص مولف تذکرہ بے نظیر، عبدالقادر مہربان، افضل بیگ قاقشان مولف تحفۃ الشعراء، لالہ لچھمی نارائن شفیق مولف چمنستان شعراء گل رعنا وغیرہم۔

مولانا آزاد کی کئی تصانیف مشہور و معروف ہیں، ۱۲۰۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

(۲) حافظ محمد علی خیرآبادی، مہاراجہ چندو لال کے زمانہ میں حیدرآباد آئے تھے مثنوی مولانا روم کا درس دیا کرتے، مہاراجہ صاحب نے یومیہ اور منصب مقرر کرنا چاہا، مگر حافظ صاحب نے اس کے لینے سے انکار کیا، روزانہ آپ کے ساتھ پچاس آدمی کھانا کھاتے تھے ۱۲۵۰ھ میں آپ اپنے وطن کو واپس ہو گئے[2]

(۳) مولوی میر ابو تراب، مشاہیر علماء سے تھے، حرمین کی زیارت کے بعد حیدرآباد آکر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، میر عالم بہادر نے فقہ کی تعلیم آپ سے حاصل کی تھی صدہا لوگوں نے آپ کے فیض سے استفادہ کیا[3]

(۴) مولوی صفدر اورنگ آبادی، بڑے محدث تھے، اور حدیث کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے[4]

---

[1] محبوب الزمن / [2] گلزار آصفیہ۔ [3] گلزار آصفیہ۔ [4] گلزار آصفیہ۔

(۵) مولوی حیدر، علماء فرنگی محل لکھنو سے تھے، درس و تدریس کے علاوہ مکہ مسجد میں وعظ بھی کہا کرتے، سرکار آصفیہ کی جانب سے جاگیر مقرر ہوئی جو آج تک ان کے خاندان میں باقی ہے[۱]

(۶) مولوی ظہور، مولوی حیدر کے فرزند ہیں، مسلمہ قابلیت تھی، درس کا سلسلہ جاری تھا[۱]

(۷) مولوی بسم اللہ، بُرہان پوری، امیر کبیر کے ملازم تھے، طلبہ کو خانگی طور پر درس دیا کرتے[۱]

(۸) مولوی عماد الدین حسین، آپ کے خاندان کا مشغلہ ہی درس و تدریس تھا آپ کے والد مولوی عطا حسین اور دادا محمد اعظم حسین کے حلقہ ہائے درس نہایت وسیع ہوتے تھے[۲]

(۹) مولوی محمد علی نظر، اورنگ آبادی شاعری کے ساتھ ساتھ درس کا سلسلہ بھی جاری تھا، عموماً دوپہر کے بعد آپ کے درس کا حلقہ قائم ہوتا تھا[۲]

(۱۰) مولوی حافظ شمس الدین فیض، آپ کے دادا مولوی رحمت اللہ دہلوی سے آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں حیدرآباد آئے، حضور کی قدردانی سے منصب جاری ہوگیا، درس و تدریس میں مشغول رہے، فیض کے والد مولوی امیر الدین کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی امیر الدین اپنی جوانی میں برار چلے گئے یہاں فیض کی ولادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی، تحصیل علم کے لئے فیض حیدرآباد آئے، اور پھر یہاں ہی اقامت کرلی،

اپنے باپ دادا کی طرح درس کا سلسلہ جاری رکھا، ایک طرف آپ کا حلقۂ درس قائم تھا تو دوسری طرف شعر و شاعری کا بازار گرم رہا کرتا۔ مدتوں اُن کا فیض جاری رہا صدہا اشخاص مستفید ہوئے، باقی، عصر، یاس وغیرہ آپ کے قابل تلامذہ ہیں ۱۲۸۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا[۳] حیدرآباد میں مدفون ہیں۔

(۴)

اب ہم قدیم نصاب کی طرف توجہ کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسے معلومات نہیں ہیں جن کے لحاظ سے قدیم نصاب کی تفصیلی صراحت کی جاسکے، مگر قدیم

---

[۱] تا [۱] گلزار آصفیہ۔ [۲] طبقات الشعراء مولف کریم الدین۔ [۳] محبوب الزمن۔

عربی نصاب کی ہمیں جو آگاہی ہوئی اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ صرف و نحو، فقہ واصول فقہ تفسیر و حدیث، منطق و فلسفہ، تصوف اور ادب ہمارے نصاب کے اہم جز ہوتے تھے، ان میں سے کبھی کسی فن کی کتابیں زیادہ ہوتی تھیں اور کبھی کم، اس کے بعد جب مولانا نظام الدین بانیٔ درس نظامیہ نے اپنے درس کا نصاب مقرر کیا تو عام طور سے مولانا کا مقرر کردہ نصاب ہی مقبول عام و خاص ہو گیا آپ کے درس کے نصاب میں حسب ذیل فنوں کی کتابیں شامل تھیں :-

تفسیر و حدیث، صرف و نحو، منطق و حکمت، ریاضی، بلاغت فقہ و اصول فقہ، کلام۔

یہ تو عربی نصاب کی حالت تھی فارسی نصاب میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا مگر فارسی میں مندرجہ صدر فنون کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، فارسی صرف، ادب و اخلاق اور انشار کی حد تک محدود ہوتی تھی، اس کے لئے مختلف زبانوں میں مختلف کتابیں مقبول رہیں، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی، کیمیا سعادت، اخلاق ناصری وغیرہ کتابیں اخلاقی درس میں شامل ہوتی تھیں، ادبیات میں مختلف دیوان مثنویات اور قصائد نصاب میں شامل ہوتے تھے، گلستاں بوستاں سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں جز لائینگ ہوتی تھیں، انشار پر خاص زور دیا جاتا تھا، کئی کتابیں اس فن کی پڑھائی جاتی، خطوط نویسی کی مشق بھی کرائی جاتی، خطاطی اور قرآن شریف بھی درس کے لازمات تھے، عموماً صبح اول وقت قرآن شریف، اور دوپہر میں بعد ظہر خطاطی کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔

شمس الامرائے مدرسہ کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ وہاں علوم مغربی کیمیا، طبعیات، ریاضی، ہیئت وغیرہ کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی، اسی طرح مدرسہ طبیہ میں طب مغربی کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی !

نصاب کے بعد اوقات درس اور طریقہ درس کے متعلق بھی مختصر صراحت ضروری ہے، قدیم زمانہ میں تعلیم کا وقت دس سے چار یا نو سے تین تک نہیں ہوتا تھا،

بلکہ تعلیم کا وقت عموماً طلوع آفتاب کے بعد ہی شروع ہوجاتا تھا۔ کوئی دوپہر کے بعد تعلیم دیا کرتا، مگر عام طور سے دوپہر میں خطاطی ہوتی تھی، سہ پہر میں عموماً تعلیم نہیں ہوتی تھی، البتہ بعد مغرب درس ہوا کرتا۔ اکثر علما جو اپنے طور پر خانگی درس دیا کرتے وہ عموماً صبح یا شام میں وقت مقرر کرتے تھے۔

زمانہ سابق میں آج کل کی طرح ایک فن کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر مختص نہیں ہوتا تھا، اکثر و بیشتر کئی کئی فنون کی تعلیم ایک ہی شخص سے حاصل کی جاتی تھی، مگر بعض علما کسی خاص فن پر زیادہ زور دیتے تھے، کتابوں کے انتخابات یا اُن کے حصے شریک نصاب نہیں ہوتے عموماً پوری کتاب پڑھائی جاتی۔

درس کا طریقہ عام طور سے یہ ہوتا کہ ایک طالب علم کتاب پڑھتا اور دوسرے اس کو سماعت کرتے، کچھ حصہ پڑھنے کے بعد مدرس مطالب کو واضح کرتا اور لغات وغیرہ کو حل کرتا۔ پروفیسر کے لکچر دینے کا طریقہ نہیں تھا۔

ابتدا میں جماعت بندی کا قاعدہ نہیں تھا، مگر زمانہ مابعد میں اس کا طریقہ رائج ہوگیا، افسوس ہے کہ ہم اس امر کی صراحت نہیں کرسکے کہ عموماً کتنے سال تک تعلیم ہوتی تھی، کیونکہ اس کا کوئی مواد ہمدست نہیں ہوا ہے۔

امتحان کا طریقہ بھی مروج تھا مگر زیادہ تر زبانی امتحان ہوتا تھا، آج کل کی طرح سوالات کے پرچے مرتب نہیں ہوتے تھے، مدرسہ فخریہ اور مدرسہ دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ میں بھی امتحان کے بعد اسناد دئے جاتے تھے۔

ٹیکمال کے مدرسہ حسینہ میں تعلیم کے ساتھ تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اسی تربیت کے لئے بھی طلبہ وہاں روانہ کئے جاتے تھے۔

جو چیز خاص طور سے ہماری قدیم تعلیم میں مابہ الامتیاز نظر آتی ہے وہ تربیت ہی ہے، ہمارے قدیم اساتذہ اور طلبہ کا تعلق صرف درس و تدریس کے حلقہ میں محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ تعلیم کے دوران اور ختم تعلیم کے بعد بھی زندگی کے ہر شعبہ میں وہ ایک دوسرے کے شریک و معاون ہوتے تھے، استاد شفیق باپ کی طرح اور شاگرد

سعادت مند لڑکے کی طرح ہوتا تھا، بلکہ شاگرد حقیقی فرزند کی طرح عزیز ہوتا تھا۔
اُمید ہے کہ اس تفصیل سے ہماری قدیم تعلیمات کی حالت ذہن نشین ہو جائے۔

نصیرالدین ہاشمی
(حیدرآبادی)

عہد عثمانی میں صنعتی اور سائنس سے متعلق ترقیاں

از

سید عبدالحکیم۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ٹی

فی زمانناً ہماری ضروریات زندگی کی اکثر و بیشتر بنیادیں سائنس پر قائم کی گئی ہیں ہماری صنعت و زراعت، ذرائع نقل و حمل، وسائل تبادلہ خیالات، طریقہ ہائے صفائی و حفظ صحت، آرائش و آسائش، تفریحی مشاغل غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں سائنس کی شرکت ہے۔ کسی قوم یا ملک کی معیاری ترقی کی جانچ اس امر سے کی جاتی ہے کہ اُس قوم یا ملک نے سائنس کو کس حد تک اپنا شریک زندگی بنایا ہے۔ مبارک دورِ عثمانی میں ملک کو جدید سائنٹیفک طریقہ پر آراستہ کرنے میں جو کوششیں عمل میں آئی ہیں۔ ماضی کے کسی دور میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ آج سے پچیس یا تیس برس قبل یہاں نہ تو سمینٹ اور ڈامبر کی کشادہ سڑکیں تھیں اور نہ ان پر تیز رو موٹروں بسوں اور لاریوں کی یہ دوڑ دھوپ تھی۔ عام گذر گاہیں تقریباً ۲۰ یا ۲۵ فٹ چوڑی مورم اور پتھر کے ٹکڑوں کی بنی تھیں۔ موٹروں کے بجائے فٹن، بگھیاں اور دوسرے فیشن کی گھوڑا گاڑیاں امراء کی سواریوں کا کام دیتی تھیں۔ ان کے آگے آگے رنگ برنگ کی وردیوں میں ملبوس ملازمین کی قطاریں ہٹو بچو کرتی ہوئی چلتی تھیں۔ عورتوں کی سواریوں میں رتھیں جن میں رنگین پردے پڑے رہتے تھے۔ چھما چھم کرتی ہوئی نکلتی تھیں۔ ہاتھی اور اونٹ جن پر گنگا جمنی جھولیں

پڑی رہتی تھیں کافی تعداد میں صبح و شام سڑکوں پر نظر آتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے فاصلے فاصلے پر تیل سے روشن ہونے والے لالٹین برقی قمقموں کی جگہوں پر نصب تھیں۔ اور ۹ یا ۱۰ بجے تک سناٹا ہو جاتا تھا۔ غرضکہ بقول ایک مضمون نگار کے "وہ شورش زندگی جو تمدن جدید کا خاصہ اور ترقی پذیر قوموں کا طرۂ امتیاز ہے یہاں یکسر مفقود نہیں تو اتنی مدھم ضرور تھی کہ بغیر کافی فکر و کاوش کے اس کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ فی الوقت "وہ شورشِ زندگی" اتنی نمایاں ہے کہ کسی "فکر و کاوش" کی مطلق ضرورت باقی نہیں اس ضمن میں حیدرآباد کے لاسلکی نشرگاہ سے ابتدا کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سائنس سے متعلقہ جدید ترین سرکاری محکمہ ہے۔

لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد میں سرکاری طور پر لاسلکی نشرگاہ یکم فروری ۱۳۴۴ف میں قائم ہوا یہ کوچہ چراغ علی میں ایک بلند پایہ عمارت میں ہے اس عمارت کے ایک کمرہ میں ٹرانسمیٹر (آلہ رسانی) ہے ایک حصہ بطور کنٹرول روم استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ایک تیرے کمرے میں موسیقی کا انتظام ہے۔ اس کمرے میں متعدد پردے مختلف زاویوں پر اس طرح لگادئے گئے ہیں کہ مقرر یا گانے والے کی آواز بجائے ادھر ادھر منتشر ہونے کے پردوں سے منعکس ہوکر مائکروفون کو زیادہ سے زیادہ توانائی سے متاثر کرے۔ پھر ٹرانسمیٹر کے ذریعہ متبادل برقی رَو کی صورت میں یہ آواز Aerial (ہوابند) جو عمارت کے بالائی حصہ میں نصب ہے جاتی ہے اور وہاں سے برقی تموج فضا میں پھیل کر آلہ سماعت کو متاثر کرتی اور پھر اصل آواز کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے آلہ سماعت کی تعداد حیدرآباد اور اضلاع پر تقریباً ایک ہزار کے قریب پہونچ چکی ہے۔ حیدرآباد کے بعض بعض موٹروں میں بھی آلہ سماعت نصب ہے۔ اور اس میں شام کو ساکن ہوں یا حرکت میں گانا سنا جا سکتا ہے فی الوقت حیدرآباد کا نشرگاہ ۵۰۰ واٹس سے زیادہ قوت کا نہیں ہے۔ لیکن ہماری حکومت اس کی ترقی میں نمایاں دلچسپی لے رہی ہے۔ حیدرآباد میں لاسلکی نظام کے واسطے ۱۵ لاکھ کی اسکیم ہے۔ جس وقت یہ نشرگاہ معہ جدید آلات کے تیار ہو جائے گا تو یہ ہندوستان کی بہترین نشرگاہوں میں سے ہوگا۔ اور حالات

موافق ہونے پر نصف دنیا میں اس کی آواز پہونچ سکیگی۔ یہ نشر گاہ ۳ تا ۵ کلیواٹس کی طاقت سے عمل کرے گا۔ اور حسب ضرورت اس کی طاقت میں (۱۰) کلیواٹس تک اضافہ ہوسکیگا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری اسکیم تقریباً ۱½ لاکھ روپیہ کی اور ہے۔ اس سے اورنگ آباد، گلبرگہ اور ورنگل میں پانچ پانچ سو واٹس کے نشر گاہ قائم کئے جائیں گے اور ان میں مرہٹی، کنڑی اور تیلگو زبان میں علی الترتیب تقاریر نشر ہونگی۔ ان نشریات کا مدعا دیہات کی کثیر آبادی کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح ہوگی۔ زرعی، امداد باہمی اصول صحت اور صفائی، بیماریوں کے روکنے کے طریقے کفایت شعاری، بہبودی اطفال۔ اور اسی نوعیت کی دیگر تقاریر جن سے دیہی آبادی کی تندرستی، دولت اور مدت میں اضافہ ہو ایک وقت میں شام کو مختلف دیہاتوں کے کھلے میدانوں میں نشر کی جائینگی۔ بنگال اور پشاور کے متعدد اضلاع میں اس قسم کی دیہی ترقی کی اسکیم رائج ہوچکی ہے اور شام کے وقت بعض بعض مقامات پر لڑکے، جوان، بوڑھے، مرد عورتوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی نشریات کی اہمیت دن بدن بڑہتی جارہی ہے۔ حال میں روزانہ ایک ساعت تعلیمی اطفال کے نام سے حیدرآباد کی نشر گاہ کے نظام العمل میں اضافہ ہوا ہے اس میں اصول تعلیم سے متعلقہ نشریات کا انتظام ہوتا ہے۔ جو طلباء اور اساتذہ کے لئے نہایت دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ نہایت مفید ہے۔ جشن سیمین شاہانہ کے سلسلہ میں محکمۂ لاسلکی کی مصروفیات میں بہت اضافہ ہوجائے گا۔ اسی سلسلہ میں اہم تقاریر نشر کرنے کا اس طرح انتظام کیا جائے گا کہ وہ نہ صرف بیرون ممالک محروسہ بلکہ بیرون ہند بھی بخوبی طور پر سنی جائیں جوبلی ہال اور نمائش گاہ باغ عامہ میں آلات ترسیلی اور موصولی کی تنصیب عمل میں آئے گی۔ اور شہر کے گوشہ گوشہ میں آلات سماعت نصب کئے جائیں گے۔ جن پر عوام جشن جوبلی سے متعلق نشر گاہ سرکار عالی کے نشریات کے علاوہ دیگر سرکاری تقاریب کی روئداد وغیرہ کی سماعت کرسکیں گے۔ اطراف بلدہ میں محکمہ لاسلکی کی موٹر لاریاں جو آلہ جات موصولی سے لیس ہونگی چکر لگائیں گی جن پر

مواصعات کی رعایا موسیقی وغیرہ کی سماعت لاسلکی کے ذریعہ کرکے جشن شاہانہ میں شرکت کرسکے گی۔

محکمۂ برقی وٹیلیفون ۱۳۱۸ف سے قبل اعلیحضرت مرحوم کے زمانہ میں مختلف تجارتی کمپنیوں نے دارالسلطنت کی سربراہی قوت برقی کے متعلق تجاویز پیش کیں لیکن ان سب نے اپنی تجاویز کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ ان کمپنیوں کو اختیار ہوگا کہ وہ برقی ٹراموے بھی تعمیر کریں۔ حضرت غفران مکان نے بالکل بجا طور پر اس شرط کی مخالفت کی۔ لہذا کچھ عرصہ تک حیدرآباد میں برقی سربراہی کا انتظام نہ ہوسکا۔ اسی زمانہ میں کہیں کہیں برقی رَو پیدا کرنے والی چھوٹی چھوٹی مشینیں نصب تھیں جن سے خاص خاص موقعوں پر برقی روشنی حاصل کی جاتی تھی اس قسم کی ایک چھوٹی مشین قصر فلک نما میں تھی اور ۱۲ کلوواٹس کی ایک دوسری مشین دارالضرب میں تھی۔ ابتداء میں اس مشین سے دارالضرب کے بنگلہ میں برقی سربراہی کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں اسی مشین کے ذریعہ قریبی دفاتر فینانس، تعمیرات اور محکمہ سیاسیات میں برقی پنکھے چلانے کا انتظام کیا گیا۔ ان برقی پنکھوں کا انتظام دیکھکر اکثر ذی اثر حضرات نے خواہش ظاہر کی کہ آیا ان کیلئے بھی ایسا انتظام ممکن ہے۔ لیکن عام طور پر برقی سربراہی کی پہلی باقاعدہ اسکیم ۱۳۲۱ف سے قبل عمل میں نہ آسکی۔ اسی سال محکمۂ برقی کے لئے ۱۱ لاکھ کی منظوری ہوئی اور آغاز ۱۳۲۲ف میں ایک باقاعدہ چھوٹا سا Power House (پاور ہاؤس) جس میں دو برقی مشینیں مع ضروری سازوسامان کے نصب کی گئیں تعمیر ہوا۔ چنانچہ برقی روشنی بند حسین ساگر کے ہر دو جانب اور بلدہ میں براہ ریزیڈنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ڈیوڑہی تک کیگئی۔ اس مشین کے ذریعہ سکندرآباد میں تالاب حسین ساگر سے برقی پمپ چلاکر آبرسانی کا بھی انتظام کیا گیا اور اوائل ۱۳۲۲ف میں سکندرآباد کے گلی کوچوں میں بھی اس مشین کے ذریعے برقی روشنی کی سربراہی عمل میں آئی اس وقت برقی رَو کی مقدار ۵۰۰ کلوواٹس کی حد تک پہونچ گئی۔ اس چھوٹی سی مشین پر اتنا بار بھی زیادہ تھا۔ اور مانگ دن بدن بڑھتی جاتی تھی چنانچہ جلد ہی دو مشینوں کا اضافہ کرنا پڑا جس سے ۱۰۰۰ کلوواٹس تک کی سربراہی ممکن ہوسکی۔ لیکن اعلیحضرت داقدس کی زیرقیادت دارالسلطنت جس سرعت سے ترقی کررہا تھا۔ اس کے لئے بھلا کہاں

قسم کی واعذوزی سے کیسے کام چل سکتا تھا۔ چنانچہ ضرورت کے مدنظر اعلیٰ پیمانہ پر جدید پاور ہاوس تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا۔

موجودہ پاور ہاوس | یہ پاور ہاوس اپنی موجودہ جگہ پر تالاب حسین ساگر کے کنارے مکمل طور پر ۱۳۲۳ف میں تیار ہوا ختم ۱۳۳۱ف میں جملہ مصارف ۸۰ لاکھ ۸ ہزار ۶ سو اڑتالیس روپیہ ہوئے۔ چونکہ مسلسل بارش کی قلت کی وجہ سے تالاب حسین ساگر کا پانی خشک ہو کر کناروں سے دور ہٹ جاتا تھا۔ اور پانی حاصل کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے عثمان ساگر سے ایک نہر کھود کر پانی لانے کا انتظام کیا گیا۔ موجودہ پاور ہاس جدید ساخت کی مشینوں سے کامل طور پر آراستہ ہے۔ چار بہت بڑے بڑے ڈائنموز جملہ ۱۰ ہزار کلوواٹس کی برقی سربراہی کرسکتے ہیں۔ ان میں سے تین ڈائنموز تو بڑے بڑے ٹربائین (بڑے پہیے جو بذریعہ اسیٹم چلتے ہیں) کے ذریعہ چلائے جاتے ہیں۔ اور چوتھا وقتی ضروریات کے لئے محفوظ ہے جو تیل سے چل سکتا ہے اسٹیم پیدا کرنے کے لئے جدید ساخت کے جوشدآں (Boilers) ہیں ان بائلرس کی ہٹیوں میں سنگرینی کا کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ یہ کوئلہ ہوا کے تیز جھونکوں سے خودبخود بھٹیوں میں داخل ہوتا رہتا ہے یہ بھٹیاں ۲۰۰ ۱ فارن ہائیٹ کی تپش پر شعلہ زن رہتی ہیں۔ اس بلند تپش سے وقت واحد میں سینکڑوں ٹن پانی بھاپ کی صورت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ بھاپ کے دباؤ سے اول ٹربائین اور ٹربائین سے ڈائنموز حرکت میں آکر برق پیدا کرتے ہیں۔ ختم ۱۳۴۱ف میں سررشتہ برقی بلدہ پر جملہ اخراجات ۸۶ لاکھ تک پہونچ گئے اور اس کی سالانہ آمدنی ۸ لاکھ ۱۶ ہزار روپیہ ہوئی۔ اضلاع اورنگ آباد ورائچور اور نظام آباد کے برقی اسکیموں کے اخراجات ۱۱ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ ہوں گے اور توقع کیجاتی ہے کہ بہت جلد سودبخش ثابت ہوں گے۔ یہی حال سررشتہ ٹیلیفون کا بھی ہے جس پر بلدہ میں ۹ لاکھ ۲۴ ہزار اور اضلاع میں ۴ لاکھ ۲۹ ہزار کے اخراجات عائد ہوئے۔

دارالضرب و متعلقہ ورکشاپ | ۱۳۰۲ف سے قبل روپیہ ہاتھ سے بنایا جاتا تھا ۱۳۰۲ف میں ایک مشین قائم ہوئی ابتدا میں جو سکہ اس میں مضروب ہوئے وہ سکہ چرخی کے نام سے موسوم ہوئے ۱۳۱۲ف میں دارالضرب کی نئی عمارت موجودہ جگہ پر تعمیر ہوئی اور اس میں جدید

مشینری نصب ہوئی۔ اس مشین سے بنے ہوئے سکہ کو سکہ عالی کہتے ہیں۔ جس کے معنی سکہ رائج کے ہیں۔ یہ سکہ وزن میں ½ ۱۷۲ گرین ہے اور یہ بمقابلہ ۱۸۰ گرین سکہ انگریزی کے ہے۔ جو سکہ میر محبوب علیخاں بہادر کے زمانہ میں مضروب ہوئے ان پر حرف "میم" لکھا ہے اور جو موجودہ تاجدار دکن کے زمانہ میں بنے ان پر حرف میم کے بجائے "عین" (ع) لکھا ہے۔ جب ۱۳۱۲ف میں دارالضرب اپنی موجودہ جگہ پر منتقل ہوا تو ایک چھوٹی سی ورکشاپ بطور جزو دارالضرب مشینری کی ترمیم اور ضروری پرزے وغیرہ بنانے کے لئے قائم ہوئی جس زمانہ میں روپیہ کثرت سے بنتا تھا اس زمانہ میں تو ورکشاپ کے ملازمین کو کام رہتا تھا مگر جس زمانہ میں روپیہ کم بنتا تھا یا بالکل نہ بنتا تھا تو ورک شاپ کے انجام دینے کے لئے عملی طور پر کوئی کام باقی نہ رہتا تھا۔ اس بیکاری کا تدارک اعلیحضرت واقدس کی تخت نشینی کے ایک سال بعد عمل میں آیا ۱۳۲۱ف میں بعض تعمیرات اور اضافہ جات کے ساتھ ورکشاپ کو دارالضرب سے علحدہ کر دیا گیا۔ اور اس میں دارالضرب کے وقتی کام کے ساتھ ساتھ عام صنعتی باغراض سرکاری و عام خلایق کے کام کا بھی آغاز ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم کا کام بھی اس سے لیا جانے لگا۔

جنگ عظیم کے دوران میں اس ورکشاپ نے بارود، شل کے گولے، بار برداری کی گاڑیاں گھوڑوں کا ساز و سامان بنا کر برٹش گورنمنٹ کی سربراہی کی فی الوقت یہ شاپ اپنے کام کی نوعیت کے لحاظ مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ مکمل طور پر عصری آلات اور مشینوں سے آراستہ ہے۔ دھات کی ڈھلی ہوئی تجوریاں، پانی کے نل، مہریں، چپراس، تمغہ جات، فولادی چھڑیاں، ٹن لکڑی کا ہمہ اقسام کا فرنیچر ان حصوں میں تیار ہوتا رہتا ہے

رصدگاہ نظامیہ یہ رصدگاہ ۱۹۰۸ء میں اعلیحضرت مرحوم کے زمانہ حکومت میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک حکومت کی سرپرستی میں یہ ادارہ برابر ترقی کر رہا ہے اور اس وقت اس کا شمار دنیا کی بہترین رصدگاہوں میں ہے۔ ابتدا میں یہ سررشتہ فینانس کے تحت میں تھا۔ لیکن ۱۳۲۹ف میں اس کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے کر دیا گیا۔ اس میں دو بڑی بڑی استوائی دوربین ہیں۔ ان میں سے ایک اٹھ انچ والی عکسی اور دوسری پندرہ انچ والی

بصری علاقات پر جس کے ساتھ آلہ مُرور اور وقت نگار بھی ہے مشتمل ہیں۔ پندرہ انچ والی دُوربین آج سے دس برس پیشتر نصب کی گئی تھی اور یہ خصوصی طور پر متغیر تنویر کے ان ستاروں کے باضابطہ مشاہدات میں استعمال کی جاتی ہے جن کی اقل تنویر بہت کم ہے رصدگاہ میں زلزلوں کا پتہ چلانے کے واسطے دو زلزلہ نگار بھی ہیں ان سے حاصل شدہ معلومات خلاصہ زلزلیات بین الاقوامی میں اندراج کے واسطے آکسفورڈ بھیجے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رصدگاہ میں ایک جوّیاتی رصدگاہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہاں طلایہ گرغباروں کا مستقر بھی قائم کیا گیا ہے۔ جہاں حکومت ہند کے محکمہ جویات کے تعاون سے مشاہدات عمل میں لائے جاتے ہیں۔

اس رصدگاہ کا شمار ان ادارہ جات میں سے ہے جو نقشہ فلک کی بین الاقوامی ترتیب میں حصہ لیتے ہیں چنانچہ رصدگاہ مذکور نے اپنے مفوضہ منطقہ (انحراف ۱۷ تا ۲۳) کی عکسی تصاویر کی پیمائش کا کام ختم کر کے اب منطقہ ۳۶ تا ۳۹ کی فہرست کی تیاری میں مشغول ہے اس کی اہم مطبوعات حیدرآباد کی فہرست انجم نگاری کی آٹھ جلدیں اور متعدد مختصر مقالات پر مشتمل ہیں یہ مقالہ فلکیات کے بعض ممتاز جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ایک باقاعدہ دارالمطالعہ بھی اس رصدگاہ سے متعلق ہے اس میں کتب علم فلکیات اور متعلقہ رسالہ جات کافی تعداد میں موجود ہیں۔

محکمہ آب رسانی زمانہ قدیم سے لوگ سائنس کے اس اصول سے واقف ہیں کہ پانی ہمیشہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے یا رکھنے کا متقاضی رہتا ہے اس اصول کی تحت شاہان سلف اپنے محلات یا باغات کی آرائش میں پانی کے حوض بنا کر ان کے درمیان فوارے نصب کرتے تھے۔ چنانچہ حصار گولکنڈہ میں قطب شاہی محلات کے وسیع خشک حوضوں کے درمیان خاموش فوارے آج بھی بطور یادگار موجود ہیں۔ اورنگ آباد اور دیگر مقامات پر بھی قدیم زمانہ کی اس قسم کی بہتریں یادگاریں ملتی ہیں۔ اعلیٰحضرت مرحوم کے زمانہ میں سر سالار جنگ کی یادگار میں ایک محکمہ آبرسانی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پانی کا انتظام میر عالم کے تالاب سے کیا گیا تھا۔ اس کے لئے دس انچ قطر کے نل لگائے گئے تھے

اور ایک نل ۲۲ انچ قطر کا تھا جس سے غلط بڑ کو پانی جاتا تھا۔ وہاں سے صاف ہو کر یہ پانی ایک حوض میں آتا تھا جو راجہ چندو لال کی بارہ دری کے مغرب میں تھا۔ وہاں سے شہر میں تقسیم ہوتا تھا۔ نلوں کا مجموعی طول ۲۰ میل تھا۔

۱۳۲۸ف میں خزانہ آب عثمان ساگر سے حیدرآباد کو پانی پہونچانے کی اسکیم سرکار عالی سے منظور ہوئی۔ اور کام جاری ہو کر ختم ۱۳۳۱ف تک اس پر ۸۸ لاکھ ۲۹ ہزار ایک سو چھبیس روپیہ صرف ہوئے۔ عثمان ساگر سے ایک چینل تقریباً چھ فٹ چوڑی آصف نگر تک آتی ہے۔ ہر دو مقامات کی سطح میں تقریباً ۱۰ فٹ کا تفاوت ہے یہاں اس چینل کا پانی دو وسیع حوضوں میں جمع ہو کر آہستہ آہستہ تقطیری چھوٹے چھوٹے حوضوں میں داخل ہوتا ہے ان حوضوں میں نیچے سے اوپر تک مختلف جسامت کے سنگریزوں کی متعدد تہیں ہوتی ہیں۔ آخر میں سب سے اوپر باریک ریت کی تہہ رہتی ہے پانی ان سنگریزوں سے ہو کر جب اوپر نکلتا ہے تو تقطیر ہو کر خوب صاف ہو جاتا ہے یہ ریت اور سنگریزے وقتاً فوقتاً ایک مشین کے ذریعہ پمپ کی ہوئی ہوا سے خوب دھوئے جاتے ہیں۔ ہوا پمپ ہوتے وقت جو تلاطم پانی میں پیدا ہوتا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس تقطیر کئے ہوئے پانی میں مائع کلورین سے بھرے ہوئے اسطوانے سے کلورین گیس داخل کی جاتی ہے۔ تاکہ مختلف جراثیم کا خاتمہ ہو جائے۔ بعد ازاں نلوں کے ذریعہ یہ پانی شہر کے ہر حصہ میں پہونچ جاتا ہے۔ چونکہ شہر دن بدن ترقی پذیر ہے لہذا موجودہ ذخیرہ سے خصوصاً موسم گرما میں کام چلانا مشکل پڑ جاتا ہے۔ تقریباً دو لاکھ کی منظوری سے ایک دوسرا حوض زیر تعمیر ہے۔ اس حوض کو پہلے سے زیادہ بہتر سائنٹفک طریقوں پر تعمیر کیا جائے گا۔

محکمۂ زراعت اور ڈرینج مبارک عہد عثمانی میں جو جدید سررشتہ جات قائم ہوئے ان میں سررشتہ زراعت اور ڈرینج بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں سررشتہ زراعت کے قائم کرنے کی بڑی ضرورت یہ تھی کہ گورانی یعنی دیسی بڑے ریشہ دار روئی کی جگہ جو بھارت یعنی باہر کی درآمد کردہ چھوٹے ریشہ کی روئی لے رہی تھی۔ اس کو روکا جائے بڑے ریشہ کی

روئی کی سائنٹفک طریقہ پر کاشت کے لئے مزرعہ جات کھولے گئے۔ عمدہ قسم کی موزون کھاد اور تخم فراہم کئے گئے اور گورانی کپاس کو دوسری روئی کے مقابلہ میں از سر نو فروغ دیا گیا اگر یہ کوشش نہ کی جاتی تو بڑے ریشہ دار روئی چند سال کے بعد اس ریاست سے ناپید ہو جاتی۔ سررشتہ کی توجہ صرف روئی تک ہی محدود نہ رہی۔ نیشکر، تمباکو، الیری، ریشم اور دیگر فصول کی سائنٹفک اصولوں کے تحت کاشت پر بھی تجربات کئے اضلاع نظام آباد، ورنگل محبوب نگر، سنگاریڈی۔ پربھنی اور ریاست کے دیگر مقامات پر مزرعہ جات کھولے گئے اور انہیں انگلستان اور دیگر جامعات کے زراعت سے متعلقہ صاحب اسناد کا تقرر کیا گیا۔ سررشتہ ہذا کا یہ بھی کام ہے کہ وہ اپنی تحقیق و تجربہ سے پیدا ہونے والے مفید معلومات کی اشاعت کرے اور اس طرح عام کاشتکاروں کو بہترین تخم، موزون کھاد اور کاشت کے جدید طریقوں سے روشناس کرے چونکہ ملک کی معاشی حالت کی بہتری یا ابتری کا انحصار ایک بڑی حد تک زراعت پر ہے لہذا حکومت سرکار عالی نے ملک کی زراعتی حالت کو بہتر بنانے میں کسی ممکنہ کوشش سے دریغ نہیں کرتی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے آبپاشی کے عظیم الشان انتظامات وسیع اخراجات کے بعد عمل میں لائے گئے ہیں۔ پانی کو روکنے کے واسطے یہاں کی بڑی بڑی جھیلوں پر بندوں کی تعمیر کی گئی ہے چنانچہ حال میں فرمان خسروی کے ذریعہ نظام ساگر کے بند کی تعمیر عمل میں آچکی ہے جو پچاس مربع میل سے زیادہ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا پشتہ دو میل طویل ہے اندازہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے ۳ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکے گی۔

محکمۂ ڈرینج حیدرآباد میں بصرفہ ۲ کروڑ جدید ترین طریقہ ڈرینج اور آبرسانی رائج کیا گیا ہے اس طرح پر شہر کا تمام فضلا زمین دوز نالوں کے ذریعہ شہر کے باہر یہاں کے نشیب ترین علاقے عنبرپیٹھ میں پہونچا دیا جاتا ہے فضلے کے بہانے کے لئے جو پانی درکار رہتا ہے وہ حمایت ساگر سے جو ۹۲ لاکھ ۷ ہزار روپیہ کے اخراجات سے پشتہ باندھ کر تیار ہوا ہے۔ حاصل کیا جاتا ہے۔ عنبرپیٹھ میں سائنٹفک طریقوں سے اس فضلے کی صفائی کی جاتی ہے۔ اور آخر میں نائٹروجنی مرکبات کا ہلکایا ہوا آبی محلول ان مزرعہ جات پر پھیلا دیا جاتا ہے۔

جن پر نیشکر اور مختلف قسم کی ترکاریوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اس طرح پر شہر کی صفائی بھی ہو جاتی ہے اور فضلہ کے زراعت کے لئے منفعت بخش مرکبات کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا جاتا۔ ۱۳۲۲ف سے اضلاع کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور باقاعدہ سالانہ امداد کے ذریعہ جس کی مقدار نصف کروڑ تک پہونچ گئی ہے۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ ریاست ہذا کے بڑے بڑے اضلاع بہت جلد ڈرینج، آبرسانی اور دیگر لوازمات زندگی سے اس طرح فیضیاب ہوں گے جس طرح کہ باشندگان حیدرآباد ہو رہے ہیں۔

ریلویز۔ موٹر بس اور ہوائی سروس:۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں انگلستان کی ایک کمپنی نے ایک عہدنامہ کے مطابق جو اس کے اور سرکار عالی کی گورنمنٹ کے مابین ہوا تھا۔ یہاں کی ریلویز ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ میں خریدلی۔ اس کمپنی کا سرمایہ ۴۵ لاکھ پونڈ تھا۔ اس رقم پر بیس برس تک فی صد پانچ ٹکے سود دینے کی سرکار عالی کی گورنمنٹ نے ضمانت کی تھی۔ یہ ضمانتی نظام اسٹیٹ ریلوے حسب نشا جریدہ مُبارک واقع ۱۰ امرداد ی بہشت ۱۳۲۹ف ایک محفوظ رقم سے خریدلی گئی۔ اس طرح پر آج سے نصف صدی قبل ہاتھ سے نکلی ہوئی چیز پھر واپس لی گئی۔ یہ اعلیحضرت بندگان عالی کے دور حکومت کا ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ ریلوی کی خریدی کے بعد اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی فرسودگی کی کامل رقم کی وضعات کے بعد سالانہ ۱۰۸ لاکھ روپئے وصول ہو رہے ہیں۔ اس وقت ریاست ہذا کی ریلوے ۱۲۴۸ میل پھیلی ہوئی ہے۔ جدید ریلوے کی تعمیر کی تجاویز بھی حکومت کے زیر غور ہیں۔ ریلوے کے علاوہ گذشتہ ۲ سال میں بس سرویسوں کا آغاز تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ریاست میں ہوا۔ فی الوقت حیدرآباد سے ریاست کے مختلف اضلاع تک ۴۸۲ بسیں چل رہی ہیں۔ اور ان کی مسافت ۲ ہزار ۲ سو ۴۸ میل طویل ہے۔ بسوں کی وجہ سے ریاست کے مختلف اضلاع اور حیدرآباد کے باشندوں کو ایک باقاعدہ آرام دہ ارزاں ذریعہ نقل و حمل حاصل ہے ریلوں اور بسوں کے علاوہ ذاتی ہوائی ذرائع نقل و حمل استعمال کرنے کی تجویز بھی سرکار عالی کے زیر غور ہے بالفعل ایک ربع لاکھ سالانہ کی امداد کے ذریعہ جوناما کو دیگئی ہے۔ ٹرانس کانٹینٹل ایر میل (بری ہوائی میل) کا رخ حیدرآباد کی جانب

پھیر دیا گیا ہے اور اس طرح حیدر آباد دنیا کے دوسرے اہم ہوائی راستوں سے ملا دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں پرواز گاہ کے لئے موزوں گنجائش مہیا کرکے اس کا افتتاح بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت ہذا میں ہوا بازی کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

معدنیات دکن کی سرزمین خصوصاً خطہ حیدر آباد قدیم زمانہ میں اپنے ہیروں کیلئے خاص طور سے شہرت رکھتی تھی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اب یہاں ہیرے کے معادن ختم ہو چکے ہیں۔ البتہ دریائے کرشنا کی وادی میں پرتیال کے گرد و نواح کالی مٹی میں کچھ ہیرے ملتے ہیں۔ لیکن یہ ہیرے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کے نکالنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ دوآبہ رائچور میں سونا دستیاب ہونے کی امید پر باقاعدہ کام شروع کیا گیا۔ مگر یہاں سونے کا حاصل اتنا کم ہوا کہ یہ کام بھی ترک کر دیا گیا۔ حال میں ضلع ورنگل میں سنگ مرمر کی ایک چٹان دریافت ہوئی۔ جہاں ایک کمپنی کی تحت سنگ مرمر نکالنے کا کام سرگرمی سے ہو رہا ہے ادنیٰ پیمانہ پر مختلف اقسام کے خام لوہے کے ذخائر بھی گونڈوانہ کی وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن ریاست کی اہم ترین معاشی اہمیت رکھنے والی معدنیات کوئلہ ہے۔ کوئلہ کے معادن سنگارینی تعلقہ یلنڈو میں اور ٹانڈور ضلع آصف آباد میں واقع ہیں۔

سنگارینی کا کوئلہ سنگارینی میں کوئلہ کی کانوں کے کام کی ابتدا آج سے ۶۰ برس پیشتر ہوئی گذشتہ ۲۵ سال میں اسی کان سے تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا اور روزآنہ تقریباً ایک ہزار ۷ سو ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے یہاں فی الوقت دو کانیں کام دے رہی ہیں ان میں سے ایک کان ۵۰۰ فیٹ گہری اور دوسری ۴۵۰ فیٹ گہری ہے یہ کانیں کوئلہ نکالنے کے تمام جدید سائنٹیفک آلات سے آراستہ ہیں۔ برقی طاقت گاہ دو ٹربی کموتن (Turbo-generator) جن میں سے ہر ایک، ایک ایک ہزار کیلوواٹس کی قوت کے ہیں اور چار جوش دان جو جالی دار آتش دان اور ذیلی سامان سے مکمل طور پر آراستہ ہیں مشتمل ہے۔

ٹانڈور کا کوئلہ | ٹانڈور کی کانوں کا کام آج سے ۱۰ برس قبل شروع ہوا تھا اور اس وقت سے برابر ترقی پذیر ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں اس کان سے تقریباً ½۶ لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ یہاں پر بھی فی الوقت دو کانوں میں کام جاری ہے ان میں سے ایک قعر مارگن کے نام سے جو ۱۵۰ فیٹ گہرا ہے مشہور ہے اور دوسری کراسلے کا ڈھوان جس کا میلان ½۴ میں ایک ہے ان دونوں کانوں سے مجموعی طور پر روزانہ ایک ہزار ۵ سو ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ یہاں کی طاقت گاہ میں دو تربینی متبادل (Turboalternator) جو ایک دوسرے سے براہ راست مربوط ہیں ایک ایک ہزار کیلواٹس کی گنجائش کے ہیں علاوہ ازیں تین جوش دان بھی ہیں جو زنجیر والے جالی دار آتش دان اور دوسرے ذیلی سامان سے مزین ہیں۔ ان دونوں کانوں میں تقریباً ۱۰ ہزار آدمی کام کرتے ہیں جن میں سے اکثر کے لئے کانوں کے آس پاس ہی سکونت کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور انتظامات آبرسانی حفظ صحت اور سکونت پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔

صنعت و حرفت | سائنس کے موجودہ زمانہ میں کسی ملک کی خوش حالی اور بہبودی کا انحصار ایک بڑی حد تک اس ملک کی صنعت و حرفت پر مبنی ہے مبارک عہد عثمانی میں دیگر شعبہ جات کی طرح یہاں کی صنعتی ترقیوں کی جانب بھی ہر ممکنہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے اس غرض کی تکمیل کے لئے ایک محکمہ صنعت و حرفت قائم کیا گیا۔ نیز سرمایہ ترقی مصنوعات کے نام سے جس کی مالیت ایک کروڑ روپیہ ہے ریاست کی صنعتی نشو ونما کی غرض سے قائم کیا گیا اس فنڈ میں سے بعض بڑے پیمانہ کی صنعتوں مثلاً شاہ آباد سمنٹ فیاکٹری نظام ساگر کارخانہ شکر سازی کو امداد دیجاتی ہے۔ اور اس طرح جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اُسے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو مدد دینے کے علاوہ ان طلباء کی جو صنعتی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مدد کی جاتی ہے۔ اب ہم ذیل میں ان مختلف تدابیر کا ذکر کریں گے جو ریاست کی صنعتی ترقیوں کی اغراض کی خاطر اختیار کی گئیں ہیں۔

عثمانیہ مرکزی صنعتی اسکول | عثمانیہ صنعتی مرکزی اسکول ریاست ہذا کی اوّلیں باقاعدہ صنعتی درس گاہ ہے۔ جس کا قیام آذر ۱۳۲۲ف میں ایک فرمان خسروی کے ذریعہ عمل میں لایا گیا۔ اور چونکہ ذات شاہانہ کو ملک کے نوجوانوں کی صنعتی تربیت کا خاص خیال ہے۔ لہٰذا اس درس گاہ کے

قیام کے منظوری کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے نام نامی سے موسوم کئے جانے کا شرف بھی بخشا گیا۔ فی الوقت یہ درس گاہ پتھر کی ایک نہایت شاندار عمارت میں حسین ساگر کے کنارہ واقع ہے۔ طبیعات، کیمیا اور میکنکس کے دارالتجارب تمام ضروری جدید، سائنس کے سازو سامان سے۔ کامل طور پر آراستہ ہیں ان دارالتجارب کے علاوہ طلباء کو دارالضرب اور محکمۂ برقی کے کارخانوں میں بھی عملی تربیت حاصل کرنے کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔

اس صنعتی درس گاہ کے علاوہ تین اور صنعتی مدارس محکمۂ تعلیمات کے زیر نگرانی ریاست میں موجود ہیں ان میں سے دو مدارس (اورنگ آباد اور نظام آباد) سرکاری ہیں۔ تیسرا مدرسہ واقع نام پلی ایک امدادی مدرسہ ہے۔ ملک میں صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے۔ فی الوقت تعلیم کی جدید تنظیم کی تجاویز حکومت سرکار عالی کے زیر غور ہیں۔ ان تجاویز کے نفاذ پر عام تعلیم کے ساتھ ساتھ کثیر حرفتی تعلیم بھی شامل نصاب ہو جائے گی۔ اور اس طرح سائنس اور فنون کی ادبی تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم بھی عام ہو جائے گی۔ ان کثیر حرفتی اِدارات کے علاوہ جن کا قیام زیر غور ہے آج سے دو سال قبل ہماری حکومت نے پست اقوام کی حالت درست کرنے کے لئے متعدد ابتدائی صنعتی مدارس کھول دئے ہیں۔ ان مدارس میں پست اقوام کے بچوں کو ابتدائی لکھنے پڑھنے کے سوا زردوزی، کشیدہ کاری، بیبافی، سفال سازی اور دیگر دستی صنعتیں سکھائی جاتی ہیں۔ اُمید ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد برکات دَور عثمانی سے یہاں کی پست اقوام کا شمار پست اقوام میں باقی نہ رہیگا۔

ادارہ مصنوعات ملکی یہ ادارہ ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار کے صرف سے ممالک محروسہ کی گھریلو صنعتوں کی نشو و نما کی خاطر قائم کیا گیا اس کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی۔ کہ ملک کی قدیم صنعتوں کو جو یورپ کی صنعتوں کے مقابلے میں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہیں زندہ رکھا جائے چنانچہ ریاست کی مشہور قدیم صنعتیں۔ مثلاً بیدری برتن، ورنگل کے قالین، گدوال، اور جگدیو پور کے تلوار کے پھل، نرل کے کھلونے اورنگ آباد اور پائیٹھن کے ریشمی کپڑے دولت آباد کے قریب کاغذ پورے کے کاغذ اور دیگر صنعتیں اب بھی نیم جان حالت میں تھوڑی بہت باقی ہیں۔ یورپ اور جاپان کے عظیم الشان کارخانوں میں مشین کے ذریعہ تیار ہونے والی صنعتوں کے سیلاب سے ان مقامی ادنیٰ پیمانوں پر چلنے والی صنعتوں کو محفوظ رکھنے کا صرف یہی ایک

طریقہ تھا۔ کہ ان ملکی قدیم دستی صنعتوں میں مشین کا کام بھی شریک کر دیا جائے۔ چنانچہ اس ادارہ میں دستی صنعتوں میں چھوٹی چھوٹی مشینوں کی مدد بھی شامل کر دی گئی ہے۔

یہ ادارہ مشیر آباد میں ایک حال کی تیار کردہ عمارت میں ہے۔ اس عمارت میں ایک وسیع ہال ہے۔ ادارہ کا تقریباً تمام کام اسی ہال میں ہوتا ہے۔ ایک حصہ میں نساجی کا کام ہوتا ہے۔ کپڑا مشین اور ہاتھ دونوں طریقوں سے بنا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ذریعہ جو کپڑا بنا جاتا ہے اس میں فلی شٹل لوم (جدید ساخت کا کرگہ) استعمال ہوتا ہے۔ موزہ بافی اور جیائین کا کام بھی سکھایا جاتا ہے ساڑیوں اور شالوں پر ہاتھ اور مشین کے ذریعہ کشیدہ کاری بھی ہوتی ہے۔ اسی ہال میں دوسری طرف کمبل، نمدے، دریاں بنانا سکھائی جاتی ہیں۔ بیدبافی، رنگ سازی اور وارنش کا کام بھی جدید طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ قلمدوات اور دیگر اشیا بناکر ان میں نہایت خوبصورتی سے پنٹنگ کی جاتی ہے۔ حال میں جارجٹ اور کریپ سلک بنانے کے واسطے فرانس سے مشینوں کا ایک بڑا ذخیرہ آیا ہے۔ مثل عثمانیہ صنعتی اسکول کے یہاں بھی طلبار کی عملی اور نظری تعلیم کا انتظام ہے۔ تقریباً ان تمام طلبار کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔

اس ادارہ سے متعلق ایک فروخت گاہ بھی ہے اس فروخت گاہ کے نمائش خانہ میں جو باقاعدہ آراستہ کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کا تیار شدہ مال ورنگل کے مشہور قالیں اور نمدے، بید کے کام کی مصنوعات، نرمل کے کھلونے اور اورنگ آباد کا مشہور ہمرو بغرض نمائش رکھا اور فروخت کیا جاتا ہے۔

تجربہ گاہ کیمیائی ریاست ہذا میں سررشتہ صنعت وحرفت کے قیام کے بعد جلد ہی اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک کیمیائی تجربہ گاہ ایسا تیار کیا جائے جس سے یہاں کی صنعت کو خاطر خواہ مدد مل سکے۔ اس مقصد کے لئے ایک موزوں عمارت تیار کی گئی۔ اور اس کو ضروری آلات و مرکبات کیمیائی سے آراستہ کیا گیا۔ یہاں سے پانچ کیمسٹ بنگلور تعلیم کے واسطے بھیجے گئے۔ تاکہ وہاں کی انڈین انسٹیوٹ آف سائنس میں فن کیمیا کی خصوصی تعلیم حاصل کریں بعد میں ایک کیمسٹ انگلستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ لیڈس یونیورسٹی میں مصنوعات چرم کا معائنہ کرے۔ دوسرا کیمسٹ بنگلور اس غرض سے روانہ کیا گیا کہ وہاں لاک کی تیاری کا کام

سیکھے۔ حصول تعلیم کے بعد ان اصحاب نے یہاں باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ سرکاری محکمہ جات اور عوام کی جانب سے وصول شدہ مختلف اشیاء پر تجربات کے علاوہ اس شعبہ نے حفاظت گل مہوہ، الکوہل کی تیاری، موٹر اسپرٹ، تیاری سریش، انڈین ڈرگس اور دوسرے تشریحی و تالیفی تجربات کئے۔ اس کیمیائی تجربہ گاہ سے متعلق ایک باقاعدہ کتب خانہ بھی ہے اور عمارت کے ایک حصہ میں جراثیم کے امتحان کا بھی انتظام ہے۔

صنعتی کارخانہ جات | شاہ آباد سیمنٹ فیاکٹری۔ یہ کارخانہ اگست ۱۹۲۵ء میں شاہ آباد میں قائم ہوا شاہ آباد۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے پر گلبرگہ کے قریب واقع ہے۔ اور اپنے سنگ سلو اور چکنی مٹی کے لئے مشہور ہے۔ یہ اشیاء سیمنٹ کی تیاری میں بطور خام مال کے استعمال ہوتی ہیں۔ خام مال ابتداءً پیس لیا جاتا ہے پھر اُس کو پانی کی موجودگی میں خاص تناسب سے ملا کر ایک لزج مائع کی صورت میں جس کو سلّری کہتے ہیں۔ تبدیل کرتے ہیں۔ سیمنٹ کی اس طریقہ سے تیاری کا نام گردشی بھٹی کا تر طریقہ ہے۔

یہ کارخانہ پتھر توڑنے کے آلات، چکنی مٹی دھونے کی گرنیاں اور پمپ، خام مال کا تر آمیزہ بنانے کی گردشی بھٹیاں۔ تبریدی آلات سیمنٹ پیسنے کی چکیاں اور دیگر متعلقہ ساز و سامان سے کامل طور پر آراستہ ہے۔ دخانی طاقت، حاصل کرنے کے لئے پانی کو گنا ندی سے جو کارخانہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے پمپ کے ذریعہ لایا جاتا ہے۔ پانی کو بھاپ میں تبدیل کرنے کے لئے تین آبی نلی والے جوشدان ہیں۔ یہ جوشدان میکانکی زنجیر والے جالیدار آتش دانوں متوازن ہوا، گرین کے کفائیت گردوں اور تکمیلی پُر گرم کنندوں اور قائم بالذات فولادی دودکشوں کے ساتھ آراستہ ہیں۔ ان جوشدانوں کی پُر گرم بھاپ ۲۰۰ پونڈ فی مربع انچہ کے دباؤ سے ٹربینوں کو گردش میں لاتی ہے۔ ٹربینوں کی گردش سے ایک ایک ہزار کلیواٹس کے دو متبادل حرکت کرنے لگتے ہیں ان کی حرکت سے برقی رَو اور برقی رَو کی قوت سے تمام مشینری حرکت میں آجاتی ہے۔ اس طرح تقریباً ایک لاکھ ۴۰ ہزار ٹن سیمنٹ سالانہ تیار ہوتی ہے۔

گلاس فیکٹری | یہ شیشہ کا کارخانہ بیگم پیٹ سے شمال جانب فتح نگر میں ریلوے لائن کے

کنارے واقع ہے۔ ابتدا میں یہ ایک نیم سرکاری کارخانہ تھا۔ سرکار نے تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ سے اس کی مدد کی۔ لیکن مالک کارخانہ کو کئی سال تک مسلسل نقصان برداشت کرنا پڑا اور مجبوراً اس نے اس کارخانہ کو حیدرآباد کے ایک معزز شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کارخانہ کی ابتدائی ناکامی کے وجوہات پر غور کیا گیا۔ سوڈا، چونا اور سلکا کے آمیزہ کو پگھلانے کے لئے جاپان کے آتشی گھڑوں کی بجائے جدید ساخت کی مستطیل نما بھٹیاں تیار کی گئیں۔ بنگال کے کوئلہ کی بجائے جس کی قیمت حیدرآباد پہنچتے پہنچتے بڑھ جاتی ہے۔ سنگرینی کے ادنی قسم کے کوئلہ کو پوری کامیابی کے ساتھ استعمال میں لانے کی اسکیم زیر غور ہے۔ فی الوقت یہ کارخانہ بغیر کسی نقصان کے چل رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل ملک اپنے ملک کی ساختہ اشیاء کو خرید کر اس قسم کے کارخانہ جات کی حوصلہ افزائی کریں۔

کارخانہ صابن سازی | چونکہ ریاست ہذا میں بنور روغنی کثرت سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک کارخانہ چھوٹے آلات کے ساتھ جو بیس بنتے ہیں قائم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ خانگی استعمال کا صابن تیار کیا جائے ۳۲ـ۱۳۳۱ف میں کارخانہ صابن کی مزید توسیع کی گئی اور زیادہ بہتر صابن تیار ہونے لگے۔ اوائل ۳۳ف میں کارخانہ صابن سازی بحیثیت ایک سرکاری کارخانہ کے بند کر کے اس کو ریاست کے ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اب یہ کارخانہ خانگی طور پر چل رہا ہے۔

دیاسلائی سفال سازی بٹن اور متفرق کارخانجات | ریاست ہذا میں دیاسلائی بنانے کے دو کارخانے ۱۰ سال کے اندر ہی اندر قائم ہوئے یہ کارخانہ محبوب آباد اور حیدرآباد میں واقع ہیں۔ جدید آل انڈیا اکسائیز ڈیوٹی کے نفاذ سے دیاسلائی کے ہر دو کارخانجات میں عارضی طور پر کچھ بے ترتیبی واقع ہو گئی تھی لیکن اب یہ دونوں کارخانجات باقاعدہ کام کر رہے ہیں۔ ریاست میں سفال سازی کے بھی متعدد کارخانہ ہیں۔ بنگلور مینوفیکچرنگ ٹائلس اور پائپس کمپنی میں مٹی کے روغن دار بڑے بڑے نل، اگردن کے فرش کے واسطے رنگین مختلف نمونوں کے چوکے چھتوں کے واسطے ولایتی کھپرے برقی مشینوں کے ذریعہ تیار کئے جاتے ہیں۔ دکن بٹن فیاکٹری واقع حسینی علم میں مختلف نقش و نگار کے بٹن برقی مشینوں کے ذریعہ اعلی پیمانہ پر تیار ہوتے ہیں

اور تجارتی نقطۂ نظر سے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ دکن فیکٹری کے علاوہ ریاست میں بٹن اور ٹوپی کے پھندنے بنانے کے تین کارخانہ اور ہیں۔ ان کارخانوں میں مختلف قسم کے بٹن پر زرد پیلی، سنہری، رولڈ، گولڈ اور مینا کا کام نہایت خوب ہوتا ہے۔ چار کاغذ سازی کی انجمنیں کاغذی پورہ اورنگ آباد گوڈور ویلور واقع میدک اور کورٹلہ واقع کریم نگر میں کام کر رہی ہیں۔ دیسی صنعت کے کاغذ کو مقبول عام بنانے کے لئے سرکار ہر طرح کی کوشش اور توجہ کر رہی ہے۔ آزمائشی کارخانہ قالین بافی ورنگل میں اعلیٰ قسم کے قالین تیار ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال ٦٥٦٤ قالین یہاں سے یورپ بھیجے گئے۔ ان کے علاوہ سگریٹ، کشید الکوہل، تیزاب گری برف کے کارخانے۔ کپڑے کی ملیں۔ روئی کی گرنیاں۔ اور متفرق کارخانجات اس مبارک عہد میں قائم ہوئے اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔

عطوفات خسروانہ بیرون ممالک محروسہ اعلیٰ حضرت واقدس کی فیاضیاں اور نوازشیں صرف باشندگان حیدرآباد ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ ذات شاہانہ کا ابر کرم بیرون ممالک محروسہ پر بھی دُور دُور برستا ہے ذیل میں وہ عطوفات شاہانہ درج کئے جاتے ہیں جن کا تعلق صرف سائنس سے متعلقہ ادارات اور تعلیمی درسگاہوں سے ہے۔

(نام ادارہ یا درسگاہ)	(عطیہ شاہانہ)	(نام ادارہ یا درسگاہ)	(عطیہ شاہانہ)
انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور	١٢٠٠٠ روپیہ سالانہ	وشو بھارتی کلکتہ	ایک لاکھ روپیہ
مسلم علیگڈھ یونیورسٹی	۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سالانہ	جامعہ فلسطین	ایک لاکھ روپیہ
بھنڈارکر انسٹیٹیوٹ	½ لاکھ ایک ہزار روپیہ کلدار سالانہ	زراعتی پبلک اسکول ڈیرہ دون	دو لاکھ روپیہ
راس انسٹیٹیوٹ لندن	ایک ہزار پونڈ	لیڈی اروِن کالج	دو لاکھ روپیہ
لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی	ایک لاکھ روپیہ	امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ	دو لاکھ روپیہ

الغرض ہمارے شفیق بادشاہ عالیجاہ کے ۲۵ سالہ دور حکومت میں سائنس سے متعلقہ ترقیات پر اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی جس فیاضی سے روپیہ خرچ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اُسکی نظیر ریاست کی تاریخ کے کسی عہد میں نہیں ملتی۔ ہم بارگاہ ایزدی میں بکمال ادب دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ پاک ہمارے فیاض بادشاہ ذیجاہ کی عمر و اقبال میں ترقی اور برکت روز افزوں اضافہ فرما۔

دورِ عثمانی

از

جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی
اُستاد تاریخ جامعہ عثمانیہ

اس عہدِ مسعود پر روشنی ڈالنے کے لئے جو مہتم بالشان ترقیوں کا مخزن ہے سلطنت آصفیہ کی پچھلی تاریخ بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ جس پاکیزہ نصب العین کے ساتھ یہ سلطنت قائم ہوئی تھی اور جو اصول اور اخلاقی محاسن اس سلطنت کی تعمیر میں شامل ہیں وہ برابر جاری اور ہر عہد میں ترقی پذیر رہے اور موجودہ پچیس سالہ مبارک عہد جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا ہم جشن منا رہے ہیں تمام پچھلی ترقیوں کا تتمہ ہے۔ آج سلطنت آصفیہ کو قائم ہوئے کم و بیش دو سو سال ہوتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ اس سلطنت کا ہر عہد اپنی نت نئی ترقیاں لے کر آیا اور اس طریقہ سے یہ سلطنت درجہ بدرجہ دکن کی سیاسی اور اخلاقی تعمیر کرتی رہی جس کو دکن اور دکھنی قومیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود جو اس عہد مسعود کے آغاز تک ہوتی رہیں حیدرآباد کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا اور اخلاقی اور سیاسی تعمیر کا بہت کچھ سامان جمع کرنا تھا جو زمانہ حال کی خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ یہ کام قدرت کی طرف سے موجودہ اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ کے عہد مسعود کے لئے ودیعت تھا۔ اس مبارک عہد نے ایک طرف سلطنت آبدمدت کی دیرینہ روایات اور نصب العین کا پورا احترام کیا اور دوسری طرف زمانہ حال کے اقتضا کے مطابق ترقی کی وہ قوتیں جمع کیں جو ایک متمدن مملکت کے لئے ضروری ہیں۔

اس سلطنت ابدمدت کے قائم کرنے والے دنیا کے بڑے بڑے تاریخ ساز تھے جو بڑے علم و فضل اور تمدنی سرمایہ کے ساتھ ترکستان سے آئے تھے۔ اگرچہ سلطنت آصفیہ کے بانی حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول ہیں لیکن اس سلطنت کی تاسیس میں آپ کے

مقدس باپ اور دادا کا بھی بڑا حصہ تھا۔ حضرت آپ کے باپ و دادا شہنشاہ اورنگ زیب کے ابتدائے عہد میں ترکستان سے آئے تھے۔ حضرت آپ کے دادا خواجہ عابد تھے جو عابد خاں اور قلیج خاں کے خطابات سے سرفراز ہوئے تھے اور باپ شہاب الدین خاں تھے جو غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے جلیل القدر خطابات سے ممتاز تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں دوگونہ قابلیت کی حامل تھیں ایک تو ان کا علم و فضل اور خاندانی وجاہت ان کو تمام امرائے ہندوستان میں ممتاز کرتی تھی۔ کیونکہ جس خاندان سے ان بزرگوں کا تعلق تھا وہ ترکستان کا بڑا نامور خاندان تھا اور جس کے علم و فضل اور پاکیزہ اخلاق کے تمام ترکستان میں چرچے ہوتے تھے۔ ترکستان کی سیاست اور ارادت کی دونوں طاقتیں اس خاندان کے ہاتھ میں تھیں۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کو کون نہیں جانتا یہ اکیلی شخصیت آصف جاہی خاندان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلیج خاں اور غازی الدین خاں دونوں نوواردوں نے ہندوستان میں بہت جلد اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا دوسری بات یہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ بڑے اچھے سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے شہنشاہ کے ہر آڑے وقت میں کام دیا۔ راجپوتانہ کی کٹھن مہم کھڑی ہوگئی تو شہاب الدین خاں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی اور اس کے بعد مرہٹوں کے معرکے شروع ہوئے اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر کا سوال پیدا ہوا تو ان دونوں باپ بیٹوں نے اپنے پورے سپاہیانہ دم خم سے کام لیا۔ ان مہموں کے لئے خود شہنشاہ دکن میں آگئے اور سب کام اپنے سامنے سر کئے۔ گولکنڈہ کی تسخیر ۱۶۸۷ء میں ہوئی اس قلعہ کے مشہور محاصرہ میں خواجہ عابد کا انتقال ہوا تھا۔ لیکن مغل مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس جگر دار سپاہی نے مرتے وقت جو ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا تھا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ توپ کے گولے سے اُن کا شانہ چور چور ہوگیا تھا اور شاہی جراح مرہم پٹی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جب یہ جراح شکستہ شانہ کی ہڈیاں جوڑ رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ خواجہ عابد دوسرے ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے اور پوری خاطر جمعی کے ساتھ اپنے مخاطبین سے گفتگو کر رہے تھے لیکن صدمہ اس قدر

جانکاہ تھا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے اور حمایت ساگر کے نیچے دفن ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت خواجہ عابد یہاں دفن ہوئے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اُن کا مقدس پوتا سرزمین دکن کا مالک ہو گا۔

جس طرح خواجہ عابد کا نام گولکنڈہ کے محاصرہ کے ساتھ وابستہ ہے ان کے بیٹے غازی الدین خاں فیروز جنگ کا نام بیجاپور کی تسخیر کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ تسخیر گولکنڈہ سے ایک سال پہلے عمل میں آئی تھی اورنگ زیب کے منجھلے بیٹے شاہزادہ اعظم اس مہم کے کمانڈر بنائے گئے تھے۔ لیکن جوں ہی محاصرہ شروع ہوا اندر سے دکھنی فوج اور باہر سے مرہٹہ فوج نے یورشیں شروع کر دیں۔ مرہٹوں نے تو ایسا اودھم مچا دیا کہ مغلوں کو مقابلہ کرنا تو کجا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ مرہٹوں نے جنگل اور کھیت جلا دئے اور رسد کے تمام راستے بند کر دئے۔ مغل فوج فاقوں مرنے لگی اور ایک مغل مورخ کے الفاظ میں تمام مغل سپاہی پوست واستخواں ہو کر رہ گئے تھے۔ شاہزادہ اعظم اور اس کی بیوی جانی بیگم بصد مشکل ہاتھی پر سے آواز کر کے پژمردہ فوجوں کو آگے بڑھایا کرتی تھیں۔ جب شہنشاہ کو معلوم ہوا تو شہنشاہ نے رسد پہنچانے کی کوشش کی اور اس اڑے وقت شہنشاہ کی نظر میں غازی الدین خاں سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ غازی الدین خاں کو غلہ دیا گیا کہ وہ بیجاپور تک پہنچائیں۔ لیکن مرہٹوں کے ٹڈی دل کو چیر کر مغل فوج تک غلہ پہنچانا غایت درجہ مشکل تھا۔ مرہٹوں نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ مغل فوج کی فتح وشکست اس رسد پر موقوف ہے۔ اس لئے اس رسد کو روکنے کی انہوں نے پوری کوشش کر لی اور غازی الدین خاں کو قدم قدم پر مقابلہ کرنا پڑا۔ اگرچہ اس دار و گیر میں بہت کچھ غلہ ضائع ہوا اور دشمنوں کے ہاتھ میں چلا گیا لیکن اس کی ایک کثیر مقدار مغل فوج تک پہنچ گئی۔ غلہ کا پہنچنا حقیقت میں ایک آیۂ رحمت تھا۔ اگر اس وقت غلہ نہ پہنچا تو مغل فوج کا موت کے مُنہ میں جانا یقینی تھا۔ مغل مورخ لکھتے ہیں کہ غازی الدین خاں کو دیکھتے ہی شاہزادہ اعظم ہاتھی سے اتر پڑا اور آفرین کناں غازی خاں را در بغل گرفتہ" شہنشاہ بھی غازی الدین خاں کی اس کوشش سے بہت خوش ہوئے اور ان کو ان الفاظ میں دل سے دعا دی" چنانچہ حق سبحانہ تعالےٰ از تردد خاں فیروز جنگ

شرم اولاد تیمور بہ نگاہ داشت آبروئے اولاد او تا روز قیامت خدا نگاہ دارد" دعا کے ان پر خلوص الفاظ سے جو شہنشاہ کے صمیم دل سے نکلے تھے غازی الدین خاں کا عظیم الشان کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے کس طرح اس اڑے وقت مغل سلطنت کی مدد کی تھی اور یہ دعا اب تک غازی الدین خاں کی اولاد کے شامل حال ہے اس کے بعد غازی الدین خاں مرہٹہ لڑائیوں میں مصروف رہے اور نابینا ہونے کے باوجود وہ فوجوں کی رہنمائی کی نیز برار اور گجرات کی صوبہ داری کی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول کو جن کا اصل نام قمر الدین خاں تھا دکن میں رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ باپ دادا کے ساتھ دکن میں رہے اور بچپن سے دکن کے سیاسی اور جغرافی ماحول کا مطالعہ کرتے رہے اور یہ آئندہ سلطنت آصفیہ کی تاسیس کا سامان تھا۔ چونکہ قدرت اُن کو دکن کی عنان حکومت تفویض کرنے والی تھی اس لئے ایسے حالات بھی فراہم کردئے کہ یہ قبل از وقت دکن کی سیاست سے واقف ہوجائیں۔ ورنہ ایک نئے آدمی کے لئے جس کے باپ دادا ترکستان کے نو وارد ہوں دکن میں حکومت کرنا اور اس کے نظم و نسق کے لئے نہایت خوشگوار دستور بنانا آسان نہ تھا۔ لیکن یہ دکن کی خوش قسمتی تھی کہ اس سرزمین میں مغفرت مآب جیسی لائق شخصیت دستیاب ہوگئی جو دکن کے سیاسی ماحول اور اس کی ضروریات کے ہر طرح اہل تھی۔ اس کا اندازہ مغفرت مآب کے لائق نظم و نسق سے ہوسکتا ہے۔ جب مغفرت مآب دکن کے حکمراں ہوئے تو اپنی سیاسی دوراندیشی اور فرض شناسی صرف کرکے آئندہ سلطنت کا جو نظام حکومت تیار کیا اور اپنے جانشینوں کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا تھا وہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ مغفرت مآب اس زمانہ میں واحد آدمی تھے جو یہ بار گراں برداشت کرسکتے تھے۔ اگر کچھ نہیں تو مغفرت مآب کی وہ زرین وصیتیں جو انہوں نے اپنے انتقال کے وقت فرمائی تھیں ان کی سیاسی قابلیت ظاہر کرتی ہیں کہ وہ دکن اور اہل دکن سے کس طرح واقف تھے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغفرت مآب کی زرین وصیتیں جو انہوں نے آخری وقت فرمائی تھیں ہمیشہ سلطنت آصفیہ کے زیب عنوان رہیں۔

لیکن ایک اور قابل قدر چیز جو اس سلطنت کی تعمیر میں شامل ہے وہ اس کے بانیوں کے اخلاقی محاسن ہیں۔ وہ چیز ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے کہ حضرت مغفرت مآب نے سلطنت آصفیہ قائم تو کرلی لیکن اپنے جذبہ وفاشعاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ سلطنت آصفیہ کی تاسیس کو مغفرت مآب کی بغاوت پر محمول کریں۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ تاسیس انتہائی وفاداری کا مظاہرہ تھا۔ اول تو مغفرت مآب سادات بارہہ کے مقابلہ میں مالوہ سے نکلکر برہان پور آئے تھے اور حسین علی خاں بارہہ کی فوجوں کو شمال اور جنوب دونوں جگہ شکست دیکر اورنگ آباد میں قدم جمایا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فعل تو سراپا شہنشاہ کی وفاداری پر مبنی تھا اور اس سے شہنشاہ بھی بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کے بعد حسین علی خاں اور اس کے بھائی قطب الملک کا خاتمہ ہوا اور جس سازش سے ان کا خاتمہ ہوا تھا اس میں مغفرت مآب اور اُن کا خاندان شریک تھا اور یہ مغل سلطنت کی عین خدمت تھی جیسے اس سے محمد شاہ کو سادات بارہہ جیسے بیوفاؤں سے آزاد کیا گیا تھا اور اس طرح شہنشاہ اس ترکمان خاندان کے دل سے بہی خواہ تھے۔ جب شہنشاہ آزاد ہوگئے اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو اس کے رتق وفتق کے لئے مغفرت مآب کی ضرورت تھی اور یہ دکن سے بلائے گئے۔ مغفرت مآب کو کیا عذر ہوسکتا تھا یہ فوراً شامل گئے۔ آصف جاہ خطاب اور مغل سلطنت کی وزارت جلیلہ حاصل کی۔ چنانچہ عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد مغفرت مآب نے مغل سلطنت کی دیکھ بھال شروع کی۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے دس پندرہ سال کے عرصہ میں سلطنت میں جگہ جگہ رخنے پڑگئے اور ہر طرف گھن لگ رہا تھا۔ چونکہ مغفرت مآب اورنگ زیب کے زمانہ کے منجھے ہوئے آدمی تھے اور ان کی نظر اس قدر وسیع تھی کہ وہ سلطنت کی ہر کمی پوری کرسکتے تھے۔ اس لئے اُن کی دور رس نظر نے تمام حقائق سے واقفیت پیدا کرلی کہ اب حکومت کو کیا کرنا ہے اور اس کے مطابق انہوں نے پیش نامہ مرتب کرلیا جو اس زمانہ کے حالات کا لحاظ کرتے مغل سلطنت کے بچاؤ کا پورا سامان تھا۔ اور یہ کامیاب پیش نامہ صرف آصف جاہ ہی بتاسکتے تھے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی محمد شاہ اور اُن کا دربار اس پیش نامہ کی حقیقت

سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔ جب کبھی یہ اپنا پیش نامہ لکھکر دربار میں جاتے تھے تاکہ اس کو روبراہ کیا جائے محمد شاہ رنگیلے کا دربار ہنسی اُڑاتا تھا۔ ان حالات میں مغفرت مآب اور اُن کا پیش نامہ بالکل بے کار ثابت ہوا مغفرت مآب نے دو سال انتظار کیا اور شہنشاہ کو مفید مشورے دینے کی کوشش کی لیکن حالات ایسے ہمت شکن تھے کان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر مغفرت مآب مجبور ہو کر دکن چلے گئے اور ۱۷۲۴ء میں خود مختار ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغفرت مآب کے دکن آنے سے محمد شاہ بہت خفا ہوئے اور ان کو باغی قرار دیا تھا لیکن جن حالات میں مغفرت مآب دکن آئے تھے وہ خود ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل ہر طرح جائز اور ہندوستان کی آئندہ سیاست کے لئے ہر طرح مفید مطلب تھا۔ دو سال کے تجربہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ مغفرت مآب مغل سلطنت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ مغل سلطنت زوال کے گڑھے میں جا رہی تھی اس کا روکنا اب کسی مُدبّر کے بس کی بات نہ تھی۔ کیا ایسی صورت میں مرکزی حکومت کیلئے دکن کو بھی مرہٹوں کے بھینٹ چڑھانا مفید ہوتا۔ اگر مغفرت مآب دکن نہیں آتے تو دکن کی سلطنت آصفیہ جو مغل سلطنت کی نام لیوا ہے کبھی نہیں قائم ہوتی بلکہ یہاں اُس کی جگہ مرہٹہ طاقت ہوتی غالباً اُس کی پیش بندی کر کے مغفرت مآب نے شمال کو چھوڑ دیا اور دکن میں خود مختاری حاصل کر کے مغل سلطنت کی تمام روایتیں محفوظ کر دیں اور یہ اُن کی عین وفاداری تھی۔ لیکن اُن کی وفاداری کے اس سے زیادہ شواہد ہیں مغفرت مآب خود مختار تو ہو گئے لیکن خود مختاری کے شاہی لوازم تخت، چتر اور شاہی القاب استعمال نہیں کئے۔ حیدرآباد کا سکہ بنایا گیا تو اس کے ایک طرف اپنا نام رکھا تو دوسری طرف شہنشاہ اورنگ زیب کا نام رکھا۔ یہ سب چیزیں مغفرت مآب کی وفاداری کے بین ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ دکن میں آنے کے بعد مغفرت مآب نے محمد شاہ کو جو خط لکھا تھا وہ بھی اُن کی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس خط میں پہلے شہنشاہ کی کوتاہی بتائی کہ ان کے پیش نامہ کو چلنے نہیں دیا۔ اب وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے اس میں خود شہنشاہ کا قصور ہے۔ ان حالات میں ان کا دکن آنا بہت ضروری تھا ورنہ شمال کی طرح

دکن بھی مغل حکومت کے پنجہ سے باہر نکل جاتا۔ لیکن آخر میں حضرت مغفرت مآب نے یہ کہا کہ جب مغل سلطنت کو میری خدمات کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں تھے بلکہ مغفرت مآب نے اس کی پوری پابندی بھی کی۔ چنانچہ جب ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ نے حملہ کیا تو اس نازک وقت میں مغفرت مآب کی ضرورت محسوس ہوئی اور محمد شاہ نے ان کو شمال بلایا یہ فوراً چلے گئے اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ جب نادری فوجیں دہلی میں آگئیں اور قتل عام شروع ہوا تو اس قتل کو انہوں نے ہی مسدود کردایا۔ اس کے علاوہ انتقال کے وقت اپنے بیٹے ناصر جنگ کو جو وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک وصیت وفاداری کے متعلق تھی۔ ناصر جنگ سے کہا کہ جس طرح میں مغل سلطنت کا وفادار رہا ہوں اسی طرح تم کو بھی وفادار رہنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور کیا وفاداری کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

ان اخلاقی محاسن کے ساتھ اس سلطنت کی تعمیر میں ترقی پذیر مادہ بھی شامل کیا گیا تھا کہ جیسے حالات ہوں انہیں کے مطابق سلطنت کو آگے بڑھایا جائے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ دو سو سال کے دوران میں اس سلطنت ابد مدت کو بیسیوں انقلابات سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس سلطنت کی تعمیر میں کچھ ایسا ترقی پذیر سالہ جمع کیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ہر جدید حالات کا مقابلہ کرتا رہا اور سلطنت کو انہیں حالات کے قالب میں ڈھالتا رہا۔ حضرت مغفرت مآب کے انتقال کے بعد جو دور آیا وہ کچھ کم پرآشوب نہ تھا۔ جب غفران آب نواب نظام علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے سلطنت آصفیہ متعدد دشمنوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ کمپنی مرہٹے اور جنوب میں میسور کی مخالف طاقت تھی اور اس سخت منجدھار میں سے سلطنت کے سفینۂ حیات کو صحیح سالم نکالنا تھا۔ اور یہ حضرت غفران آب کی غیر معمولی قابلیت تھی کہ انہوں نے نہ صرف دشمنوں کا مقابلہ کرلیا اپنی ہستی باقی رکھی بلکہ سلطنت کو نظم و نسق کے اعتبار سے اس قابل بنایا کہ موجودالوقت حالات کا مقابلہ کرسکے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر کا انتقال ہوا اور مغفرت مکان نواب افضل الدولہ بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ہندوستان میں غدر پھوٹ پڑا اور ہندوستان کی فضا اس قدر وحشتناک ہوگئی کہ تمام مدبروں کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ لیکن حضرت مغفرت مکان اور ان کے

وزیر باتدبیر نواب مختار الملک کی قابلیتیں برابر کام کرتی رہیں۔ غدر کا کامیاب مقابلہ کیا گیا اور حالات اطمینان بخش ہو گئے۔ لیکن اس غدر سے جو سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں ہوئی تھیں اُن کا اثر دُور رس ہونے والا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ حیدرآباد بھی ان سے متاثر ہو کر رہا۔
نواب مختار الملک نے جو حیدرآباد کے بہت بڑے محسن ہیں جدید حالات کا مطالعہ کر کے حیدرآباد کو بھی اسی راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ حضرت غفران مکان کی کمسنی کے زمانہ میں ملک کے تمام سیاہ و سفید نواب مختار الملک کے ہاتھ میں تھے ایک طرف ملک رانی تھی کھوئے ہوئے مقبوضات کو دوبارہ حاصل کرنا تھا لیکن سب سے زیادہ کام یہ تھا کہ حیدرآباد کو جدید نظم و نسق کی زنجیروں میں جکڑ کر جدید ہندوستان کا مقابل بنایا جائے۔ اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت جو نظام حکومت ہے اس کا پچاس فیصدی سے زیادہ مختار الملک کا بنایا ہوا ہے یا کم از کم اس کی تمام بنیادیں اور پائے ان کے ڈالے ہوئے ہیں۔

جب ۱۹۱۱ء میں موجودہ اعلیٰحضرت قدر قدرت نے تخت پر جلوس فرمایا تو ہندوستان کیا تمام دنیا کے حالات دگرگون ہونے لگے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس میں تمام دنیا کا باوا آدم نرالا ہو گیا۔ پرانی سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں نئی سلطنتیں بن گئیں سلطنتوں کے دساتیر بدل گئے۔ معاشرہ کی تمام ساخت بدل گئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں دو سو سال کا پرانا نظام حکومت کام نہیں دیسکتا تھا تاوقتیکہ اس میں جدید اقتضاء کے مطابق ضروری تبدیلیاں نہ کی جاتیں۔ اعلیٰحضرت حکیم السیاست کی علمی اور عملی قابلیت ہر موقعہ پر کارفرما رہی۔ اعلیٰحضرت قدر قدرت نے اپنی مملکت اور دنیا کے جدید حالات کا مطالعہ کر کے وہ علمی اور عملی تبدیلیاں کیں جس کی برکتیں سالہائے سال تک بلکہ صدیوں تک حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کو فیضیاب کرتی رہینگی اور بعض تبدیلیاں اور کارنامے تو ایسے ہیں کہ ان سے ہندوستان بھی فیضیاب ہو رہا ہے اور کئی پشتوں تک ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اول تو سلطنت آصفیہ کی تاسیس اور تعمیر خود ایسے مسالے سے ہوئی تھی جو ہر زمانہ کے جدید حالات کا مقابلہ کر سکے دوسرے حیدرآباد کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایک بہت بڑا لائق ناخدائے سیاست

ن گیا جس کا شمار دنیا کے بڑے مشاہیر میں ہے۔ اعلیحضرت قدر قدرت کی علمی و عملی قابلیت پوری طور پر واضح کی جائے تو اس کے لئے ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ اعلیحضرت کے فطری جوہر سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس پر طرہ یہ کہ تعلیم و تربیت کے بیش بہا اثرات نے جو کام کیا وہ چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ملک رانی کے ہر پہلو سے واضح ہیں۔ اس وقت دنیا کا کوئی حکمراں ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جو مشرقی اور مغربی علوم کا جامع ہو مشرقی اور مغربی سیاست اور حکمرانی کے قیمتی تجربوں سے پوری طور پر بہرہ اندوز ہو۔ باوجود دولت و کامرانی کے سادہ زندگی بسر کرے اور اپنے پر عیش و آرام حرام کرکے دن رات ملک اور عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو سچ تو یہ ہے کہ صرف حیدرآباد کو ہی تنہا اس بات کا فخر حاصل ہے کہ دنیا کا بہت بڑا حکمراں اس کا ناخدا ہے۔

ہر مملکت کا نصب العین جو اس کے پیش نہاد ہمت ہونا چاہیئے ہمیشہ بحث طلب رہا ہے کہ مملکت کو بالآخر کیا کرنا چاہیئے۔ قدیم زمانہ میں کچھ رہا اور قرون وسطیٰ میں کچھ — اس کی تاریخ بتلانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ زمانہ حال جس مقصد اور نصب العین کا قائل ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک طرف مملکت کے تمام قدرتی ذرائع سے جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہیں پورا فائدہ اٹھایا جائے اور دوسری طرف اہل مملکت کی ذہنی اور جسمانی تعمیر کی جائے۔ اس زمانہ میں بھی دو مقاصد ہر مملکت کے نصب العین میں شامل ہوتے ہیں یعنے ہر مملکت چاہیے وہ مشرقی ہو یا مغربی پہلے اپنے قدرتی ذرائع کو دریافت کرکے ان سے فائدہ اٹھاتی ہے یعنے معاشی ترقی کے ہر ممکنہ وسائل سوچتی ہے اور اُن کو رُو براہ کرتی ہے تاکہ ملک کی دولت میں اضافہ ہو اور وہ معاشی اعتبار سے دنیا کا مقابلہ کرسکے دوسرے اہل ملک کی ذہنی اور جسمانی تربیت کرکے اُن کو ایک زندہ قوم بناتی ہے قوم کی زندگی کا راز یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ کو مانجھ کر ان کی خفتہ قوتوں کو جگایا جائے تاکہ وہ ان قوتوں سے خود اپنی خدمت کریں اور ان قوتوں کو یکجا کرکے ملک کی خدمت کریں۔ اور اگر یہ دونوں مقاصد مملکت کے پورے ہوجائیں تو اس کا شاہراہ ترقی پر گامزن ہونا یقینی ہے اور وہ ایسی طاقت ہوگی کہ اس کا مقابلہ ناممکن ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو بڑی مملکتیں ہیں

ان کا راز صرف اس قدر ہے کہ ایک طرف انہوں نے ملک کے قدرتی ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور دوسری طرف اہل ملک کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی اور اس طرح وہ ناقابل تسخیر ہو گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حیدرآباد نے ان مقاصد کی کہاں تک تکمیل کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پچیس سالہ عہد مسعود کی تمام کارفرمائیوں کو حصر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حیدرآباد کا نصب العین بھی صرف یہی تھا۔ یہی دو مقاصد اس کے پیش نہاد ہمت تھے اس نے اپنے قدرتی ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اہل ملک کی ذہنی تربیت کے ذخیرے جمع کر دئے۔

ان دونوں کارفرمائیوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ جہاں تک قدرتی ذرائع کا تعلق ہے وہ درحقیقت اچھی تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ چھوٹا مضمون اس تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ باغ عام کی نمائش ان تمام ترقیوں اور کارفرمائیوں کا زندہ مرقع تھا ہر سررشتہ کی رپورٹ زبان حال سے اس کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن یہاں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس پچیس سالہ عہد نے ملک کے قدرتی ذرائع کی پوری چھان بین کی۔ ان چیزوں اور مواقع کو دیکھا جہاں ترقی کی گنجائش تھی، معدنیات دیکھے، جنگلات دیکھے، زراعت کو ترقی دینے کے ممکنہ وسائل سوچے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ دکن ایک زراعتی ملک ہے۔ زراعت کے ساتھ یہاں ایسی پیداوار انعام ہی پیدا ہو سکتی ہے جو صنعت و حرفت میں ترقی دے۔ لیکن دکن کی بارش قابل اعتبار نہیں۔ کبھی دکن کی بارش پر اعتماد نہیں ہو سکا۔ اب زراعت کو فروغ دینے کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی پانی کی ایسے خزانے جمع کئے جائیں جو استقلال کے ساتھ زراعت کی مدد کر سکیں۔ عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر کی تعمیر لاکھوں روپیوں کے خرچ سے کی گئی اور یہ عظیم الشان خزانہ آب اپنی تمام امید افزا وسائل ترقی کے ساتھ برطانوی ہند میں بھی بہت کم پائے جاتے ہیں تنگبھدرا کا منصوبہ پورا ہو جائے تو اس سے بھی بہت بڑا اضافہ ہوگا ان خزانوں کے جو فائدے ہیں وہ کسی بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ ہزاروں ایکڑ زمینیں جو خشک اور بنجر پڑی ہوئی تھیں وہ سیراب ہو گئیں اور وہ دن دور نہیں کہ وہ اہل زراعت کی محنتوں سے سونا اگلنے لگیں گی۔ محکمۂ زراعت کی ترقی اور اس کی زندگی سے بھی

اس موضوع میں جان پڑگئی۔ زراعت کے ہر شعبہ میں فروغ محسوس ہو رہا ہے۔ اس طرح معدنیات جنگلات اور صنعت و حرفت کا حال ہے۔ غرض تمام قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے اور آئندہ ترقی کے لئے راستے صاف کئے گئے۔

اب رہی ذہنی ترقی وہ پچیس سالہ عہد مسعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ذہنی تربیت کے قریبی وسائل سوچنے اور اُن کو مرتب کرنے سے پہلے ان کے تمام محرکات کو پیدا کرنا بھی ضروری تھا جو بالواسطہ ذہنی تربیت کے باعث ہو سکتے ہیں۔ منجملہ اور محرکات کے خود حکومت کے آلات کو منظم اور زمانہ حال کے اقتضا کے مطابق شگفتہ کرنا تھا۔ جنگ کے بعد جو حالات بدلے تو ہر جگہ حکومت میں جمہوریت اور عمومیت کے عناصر پیدا ہونے لگے ملوکیتیں قائم رہیں لیکن ان میں حسب ضرورت عمومی عنصر بڑھائے گئے۔ اعلیحضرت قدر قدرت نے بھی حیدرآباد کے نظام حکومت میں تھوڑی تبدیلی کر کے وہ شان پیدا کر دی جو عمومی حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ "باب حکومت" قائم کی گئی جس میں تمام وزرا باہمی مشورہ سے مملکت کی تجاویز سوچیں اور ان کو روبراہ کریں۔ یہ مشورہ باب حکومت کے قیام سے پہلے مفقود تھا ہر وزیر جو معین المہام کہلاتا تھا اپنے ذاتی صوابدید سے کام کرتا تھا اور غالباً اس کے نتائج اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اب باب حکومت کی اجتماعی شکل سے مملکت کے رتق و فتق میں ایک عمومی شان پیدا ہوگئی ہے جو عمومی مملکتوں کو حاصل ہے۔ اور اس کے اوپر رئیس وقت کی بلند ترین قابلیت ہر کمی پوری کرنے اور ملک کی صحیح رہنمائی کرنے کیلئے موجود رہتی ہے۔ یہاں باب حکومت کے فیصلوں اور مشوروں میں جو خامی ہوتی ہے وہ اوپر کی رہنمائی سے دفع ہو جاتی ہے۔

جدید آلات حکومت کی رہنمائی سے جس میں ایک عمومی شان پائی جاتی ہے جو مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ظاہر ہے اس سے ملک کی ذہنی تربیت کا بہت بڑا سامان جمع ہوگیا۔ ذہنی تربیت اچھی تعلیم اور اس کے خاطر خواہ انتظام پر موقوف ہے۔ تعلیم کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ تعلیم کی پہلی منزل جہاں ایک بچہ اپنے گھر سے نکل کر مدرسہ میں داخل ہوتا ہے بہت اہمیت رکھتی ہے اور یہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس کے

نقوش ایک بچہ کے دماغ میں آخری عمر تک رہتے ہیں اچھے نقوش ہوں تو اچھے اور برے ہوں تو برے اور ان کے اچھے اور برے نتائج ایک طالب علم کے عمر بھر تک شامل حال رہیں گے۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم کی منزل آتی ہے اور یہ بھی اپنی جگہ کم اہم نہیں ہے۔ ان چیزوں کی اہمیت کے مد نظر اس پچیس سالہ عہد مسعود میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے انتظام میں جس قدر مبالغہ کیا گیا ہے وہ کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے خود ملک کے تمام ارباب تعلیم اس کام کے لئے مصروف کئے گئے، اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر جہاں اچھے نظام تعلیم پائے جاتے ہیں ان کا مطالعہ کیا گیا۔ چنانچہ جاپان اور ٹراونکور کے مخصوص نظام تعلیم سے استفادہ کیا گیا اور جو کمی تھی ان سے پوری کی گئی۔ ابتدائی تعلیم بالکل مفت کی گئی تاکہ ہر طالب علم بلا دقت تعلیم سے استفادہ کر سکے نیز یہ آئندہ جبری تعلیم کا پیش خیمہ بنایا گیا۔ جب اس طرح راستہ صاف ہو جائے تو جبری تعلیم کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ مقامی زبانوں پر بھی زور دیا گیا کہ بچوں کی تعلیم سہل اور عام فہم ہو سکے۔ اور یہ سب انتظام کچھ کم امید افزا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت وقت کی نظر اس قدر وسیع اور حوصلے اس قدر بلند ہیں کہ یہ انتظام ہی کافی نہیں سمجھا جا رہا ہے چنانچہ اعلیٰحضرت قدر قدرت نے اپنے جواب ، ڈریس میں ارشاد فرمایا تھا کہ ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے دائرہ میں حیدرآباد نے جو خدمت انجام دی وہ بہت آفریں کہی جا سکتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اس عہد مسعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر اور چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے جامعہ عثمانیہ اکیلی اس عہد کی عظمت واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اور اس کے انوکھے اسلوب تعلیم کا نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان ہمیشہ ممنون رہے گا اور اس عہد کو دنیا صدیوں تک یاد کرے گی۔ مادری زبان صرف صحیح ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم اس کے ذریعہ اچھی طرح سرانجام کر سکتی اور جزو بدن ہو سکتی ہے گویا دوسرے الفاظ میں ایک بچہ کی پرورش محض دودھ سے نہیں بلکہ شیر مادر سے ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اس جامعہ کے نتائج سے ہو سکتی ہے

یہ اگرچہ ایک نوخیز جامعہ ہے اور اس کو قائم ہوئے ابھی بیس سال نہیں ہوئے لیکن قلیل مدت میں اس جامعہ نے جو امید افزا نتائج ادب اور علوم کی شکل میں حاصل کئے ہیں وہ ملک کا بڑا سرمایہ ہے اور وہ کسی جامعہ کو حاصل نہیں ہے۔ ہر شعبہ میں ایک نئی اُپج ہے۔ ہر شعبہ علم و ادب اپنی پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اگر جامعہ اور اس کی پیداوار کی یہی رفتار رہی تو یہ دنیا کی بہت بڑی جامعہ ہو کر رہیگی اور پورے ہندوستان کو سیراب کرے گی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ملک میں اس جامعہ کی مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ جب ملک میں تمام کاروبار اُردو میں ہوتے تھے۔ دفتر اُردو میں تھا۔ قانون اور تمام قانونی کارروائیاں اُردو میں ہوتی تھیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم اُردو میں نہ ہو۔ اُردو حیدرآباد کی زبان ہے جو سب بولتے ہیں اور اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور تعلیم بھی آسانی سے ہوسکتی تھی چنانچہ جب جامعہ قائم کردی گئی تو ہر علم و فن اُردو میں پیش کردیا گیا جو حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کے لئے نئی چیز نہیں تھی۔ باہر کے لوگ اس تعلیم اور ذریعہ تعلیم کو دیکھکر حیرت کرتے تھے لیکن حیدرآبادیوں کو حیرت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ حیدرآباد میں ہر چیز اُردو میں ہوتی ہے۔ نیز حیدرآبادیوں کو ملک کے اُردو کاروبار کے لئے تیار کرنا ہے کہ یہ طلبہ جامعہ سے خارج ہوکر ملک کے ہر گوشہ میں پھیلیں اور ملک کے نظم و نسق میں حصہ لیں اور ظاہر ہے کہ یہ غرض انگریزی ذریعہ تعلیم سے پوری نہیں ہوسکتی۔ انگریزی ذریعہ تعلیم جو بہت زمانہ سے حیدرآباد میں رائج تھا وہ کسی طرح مفید مطلب ثابت نہیں ہوا اور اُس کی پیداوار کبھی اُمید افزا نہیں ہوئی اور اس سے ملک کو کوئی مواد نہیں ملا۔

عہدِ عثمانی میں اُردو ادب کی ترقی

از

جناب عبدالقادر صاحب سروری ام۔ اے؛ ال ال۔ بی (عثمانیہ)

پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

آج سے ربع صدی قبل، اُردو زبان اور ادب، اپنے مصلحین کی مساعی کی پہلی کرنوں سے منور ہونے لگے تھے، اور شمالی ہند میں حالی، نذیر احمد، شبلی اور شرر اور دکن میں کیفی، توفیق وغیرہ ابھی بقیدِ حیات تھے، اور برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اپنی زبان اور ادب کا ذخیرہ بھی اگلی رسم پرستی کی زنجیروں سے خلاصی پائے اور دنیا کی متمدن زبانوں اور ادب کی صف میں آجائے۔ لیکن ان کی اصلاحی تحریکات کی مخالف قوتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ قدیم اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو ان مصلحین کی جدت طرازیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور جب موقع ملتا اس کے خلاف اپنے خیالات کے اظہار سے، ان تحریکات کے خلاف ردِ عمل پیدا کرنے کی کوشش سے نہیں چوکتی تھی۔ یہ ایسے اسباب تھے کہ ان کی وجہ سے مصلحین ادب کے ذہنوں میں بھی، آئندہ کے متعلق کوئی معین تصور جمنے نہیں پاتا تھا۔ اور یہ لوگ ملک کی قدامت پرستی سے نالاں تھے۔ قدامت پرستی کے جذبہ کی کارفرمائی میں کسی نئی تحریک کا اثر جمنے نہیں پاتا تھا۔ ایسی فضا میں سرزمینِ دکن کی عنانِ حکومت ایک روشن خیال اور زبردست حکمران کے ہاتھوں میں آتی ہے۔ یہ ہستی اپنی روشن خیالی اور علم و ادب سے غیر معمولی شغف کے سبب ان مصلحین کی سرپرستی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ نئی تحریکات کے بانیوں کی ذاتی اور شخصی طور پر مدد کی جاتی ہے تاکہ انہیں پشت پناہی حاصل ہو۔ اور وہ مایحتاج زندگی کی فکر سے آزاد ہو کر اپنے مقدس کام میں اطمینان کے ساتھ منہمک ہو سکیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، مشتاق حسین، سید احمد، غرض ہند کے دور دراز خطوں کے اہلِ کمال پر اس ذاتِ شاہانہ کا پرتو سایہ فگن ہوتا اور بواسطہ یا بلا واسطہ

ان کی ہمت افزائی کا باعث ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی علمی اور ادبی خدمات میں برابر منہمک رہتے ہیں۔

ان شخصی اعانتوں کے باوجود، مرکز کا فقدان، ان باکمالوں کی مساعی کے اجتماعی زور اور اہمیت حاصل کرنے میں سدراہ بنا رہتا ہے۔ ذات شاہانہ کی دوربین نظریں اسکو بھی تاڑ لیتی ہیں۔ اور سارے ہندوستان کی اُردو دنیا کے لیے آپ کی فیاضی اور روشن خیالی ایک مرکز، جامعہ عثمانیہ کی صورت میں تشکیل فرماتی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ، ایک نازک مرحلہ پر، اور ایک ایسے دور میں کہ اُردو و ادب اصلاح کی شاہ راہ پر داخل ہونے کے لئے آمادہ ہو رہا تھا، اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی علمی دلچسپیوں اور شہرۂ آفاق فیاضیوں نے اس کی ایسی خدمات انجام دیں، جو عہد آفریں ثابت ہوئیں۔ ان دلچسپیوں اور فیاضیوں کی بدولت اُردو زبان اور ادب کے منتشر حوائج کو مجتمع اور ہم آہنگ ہو کر، اپنی زبان اور ادب کی عظمت کے لئے کارنمایاں انجام دینے کا موقع ملا۔

ذات شاہانہ کی سریرآرائی کے وقت، اُردو و ادب، نظم اور نثر دونوں میں جدید خیالات سے روشناس ہونے لگا تھا لیکن ہر چیز ابھی تک غیر معین تھی۔ اس عظیم الشان زبان اور اس کے پرعظمت ادب کے امکانات پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے تھے۔ کیونکہ منتشر تحریکات کو، ایک جسم نامیہ میں تشکیل دینے والے کی کمی تھی۔ پھر ہندوستان کی قدامت پرستی کے مدنظر، اس اہتمام بالشان کام کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی، جو مختلف الخیال اجزا کے درمیان، ترکیبی اور تعمیری اثر ثابت ہو۔ بالفاظ دیگر، ایک روشن خیال سماجی آمر کی ضرورت تھی، جو زمانہ کا رخ پہچان کر اس کے لئے راہ ہموار کرے اور اپنی ملت کو اس کے خیر مقدم کے لئے تیار کرے۔ یہ خصوصیت، مشیت نے حضرت سلطان العلوم کے حصے میں لکھی تھی۔ چنانچہ آپ نے، ہندوستان کی اس ضرب المثل قدامت پرستی کے خلاف جہاد کیا، جو انہیں اپنی ہر چیز کے متعلق احساس پستی میں مبتلا رکھتی ہے اور انہیں ابھرنے نہیں دیتی۔ اور اپنے ملک میں علم و فن کی سوتیں جاری کرنیکے لئے

ہندوستان کی سرزمین ہی کی ایک سوت کھول کر، اس کے منبع کو ایک طرف مغرب اور دوسری طرف ایران و عرب کے سرچشموں کے ساتھ استوار کرکے، خود اپنے پایۂ تخت میں اپنی خاص نگرانی میں، ایک عظیم الشان مخزن اور مرکزِ علم تیار کر لیا، جس کے فیض جاری سے آج سارا ہندوستان سیراب ہو رہا ہے۔

جامعہ عثمانیہ، ایک ہندوستانی زبان کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں جدید علوم کی اشاعت اور ترویج کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سلسبیل علوم سے ہندوستانی علوم اور ادب کے جو جو خطے سیراب ہو رہے ہیں۔ ان کا تھوڑا بہت اندازہ ابھی سے ہونے لگا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ آزاد اور حالی نے، قدیم اصناف سخن کی صوری پابندیوں کا پورا احترام محفوظ رکھتے ہوئے بھی، جب نئے مضامین کو ان میں داخل کرنے کی جرات کی تو زبان اور قلم کے دربان قدم قدم پر حائل ہو رہے تھے یا اب یہ حال ہے کہ جدید سخن سرا، صوری پابندیوں کو بھی پس پشت ڈالنے کو تیار ہیں، لیکن کوئی محسوس نہیں کرسکتا۔ اردو نثر پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ سرسید احمد خاں جیسا جری مصلح بھی، رائے عامہ سے مرعوب ہوکر، اپنی کتاب "آثار الصنادید" کو مولانا امام بخش صہبائی سے ان کے خاص اسلوب میں لکھانے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور میر امن جیسا مقبول انشاپرداز، "باغ وبہار" میں سادہ سیدھی اور عام بول چال کی زبان استعمال کرکے، رجب علی بیگ سرور کے حملوں کا مورد بنتا تھا، یا اب یہ حال ہے کہ علم و فن کی ترویج کے سبب، اسلوب بیان میں مغربی انداز کے تغیرات کا ایک حشر برپا ہے، اور لفظیات میں ہر صوبے اور ہر زبان کے اثرات کی وجہ سے ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ادبی تحریروں میں ان کو جگہ ملتی جا رہی ہے، لیکن کسی قدامت پرست کو کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوتی!

مذکورہ بالا اجمال کی کچھ تفصیل، اس دور کے حیدرآبادی کارناموں کے ذریعہ ذیل میں کی جاتی ہے۔ اس مبارک عہد میں حیدرآباد جن ادبی کارناموں کی وجہ سے ممتاز رہا، ان میں سب سے پہلے قابل ذکر تنقید، تاریخ زبان اور ادب اور خاص طور پر قدیم زبان اور ادبی کارناموں کی تحقیقات ہے۔ اس وقت حیدرآباد میں تحقیق کا جو

اور اداروں کی ایک خاصی تعداد اس کام کے لئے ہمہ تن وقف ہے۔ اس سلسلہ میں جو کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں ان میں "ہندوستانی صوتیات"۔ "ہندوستانی لسانیات"۔ "اُردوئے قدیم"۔ "دکن میں اُردو"۔ "اُردو شہ پارے" کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کے بیسیوں قدیم تذکرے، جو شعرائے قدیم کے حالات پر مشتمل ہیں اور قدیم شعرا کے ادبی کارنامے قابل ذکر ہیں۔ تذکروں میں 'میر' کا "نکات شعرا"۔ گردیزی کا تذکرہ شفیق اورنگ آبادی کا "چمنستان شعرا" مصحفی، لطف قائم چاندپوری اور خلیل کے تذکرے۔ فائق کا تذکرہ شعرائے گجرات۔ اور ادبی کارناموں میں "سب رس"۔ "کلیات ولی"۔ "دیوان تاباں"۔ "انتخاب کلام میر" مثنوی خواب وخیال" جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ انجمن ترقی سے شائع کئے ہوئے تذکروں کے علاوہ بعض اور قدیم تذکرے بھی شائع ہوئے جن میں "گلشن گفتار" (خواجہ حمید اورنگ آبادی) بہت قدیم ہے۔ "انتخابات شعرائے دکن" اور "سلسلہ ادبیات اُردو" کی بعض تصنیفات بھی قابل ذکر ہیں جیسے "سراج سخن"۔ "کیف سخن"۔ "متاع سخن"۔ "ایمان سخن" وغیرہ بسلسلہ ادبیات کا "مرقع سخن" نہایت ضخیم اور قیمتی کارنامہ ہے۔

یہ کارنامے درحقیقت اُردو زبان کے بنیادی مسائل پر حاوی ہیں۔ ان کی اشاعت سے اُردو زبان کی قدامت اور وسعت کے متعلق جو خوشگوار حقایق بے نقاب ہوئے ہیں، ان کے اثرات دوررس اور پائدار ہیں۔ ان تحقیقات کی روشنی میں قدیم انشار پردازوں کی تحقیقیں افسانہ معلوم ہونے لگی ہیں۔

اس قدیم اور اہم دور کے علاوہ، نسبتاً بعد کے ادوار پر بھی جو وسیع تحقیقاتی کام اس دوران میں انجام پا تا رہا ہے۔ اس کا حصر کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ اس میں سے بہت کم مواد کتابی صورت میں منظر عام پر آسکا ہے۔ جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنویات میر (۲) سودا، اور اُن کا عہد (۳) دیوان یقین (۴) دیوان اثر (۵) دیوان تاباں (۶) دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز (۷) اردو ادب میں لکھنو کی حقیقی خدمات (۸) ارباب نثر اُردو (۹) مثنوی رموز العارفین (میر حسن) (۱۰) داغ

(۱۱) جدید اُردو شاعری (۱۲) انگریزی ادب کا اثر اردو ادب پر (بزبان انگریزی) (۱۳) غالب (بزبان انگریزی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے) (۱۴) اردو کے اسالیب بیان (۱۵) تنقیدی مقالات (۱۶) عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی وغیرہ۔

مذکورہ بالا شائع شدہ کتابوں کے علاوہ، اتنی کتابیں جامعہ کے مقالوں یا مسودوں کی شکل میں ابھی منتظر اشاعت ہیں ذیل کے عنوانات سے ان کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکیگا ولی، اُن کی حیات اور شاعری، دکن کی مرثیہ نگاری مغربی زبانوں کے اردو ترجم — ماہ لقا بائی چندا، اکبر الہ آبادی (حیات اور شاعری) انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، عربی ادب کی مختصر تاریخ، سوانح نگاری، چکبست کی حیات اور شاعری۔

تاریخ ادب اور زبان سے ہٹ کر، ادب خاص میں نظم اور شاعری کو خاص فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک، خود اعلحضرت سلطان العلوم کا شعری اور ادبی ذوق ہے۔ آپ کا دربار ابتدا ہی سے ہند اور دکن کے ممتاز شعرا کا مرکز رہا۔ اور ان پر آپ کے الطاف طرح طرح سے ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر شاؔد کی سرپرستیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آپ کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جتنے باکمال شعرا، دکن میں پیدا ہوئے، یا شمالی ہند سے یہاں وارد ہوئے، سب کو اس سے حصہ ملا۔

حیدرآباد کی موجودہ ادبی چہل پہل میں قدیم اساتذہ اور جدید طرز کے نوجوان شعرا دونوں کا حصہ ہے۔ اُردو شاعری میں جدید صوری اصلاح کے اولیں علمبردار، عظمت اللہ خاں مرحوم، اس عہد کی پیداوار ہیں ان کی دلکش نظمیں جو اس وقت اولیں تھیں، ہمیشہ اولیں رہیں گی۔ مولانا سلیم مرحوم نے جو اپنی شاعری کے ذریعہ نوجوانوں میں روح عمل پیدا کرنے کے لئے لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں، اپنی عمر کے آخری اور بہترین سال اس عہد خوش بختی میں گذارے۔

جدید شاعری کا ذوق، جو اس وقت سارے ہندوستان میں جاری اور ساری ہے، اس کو آگے بڑھانے میں جامعہ عثمانیہ کے خوش فکر شعرا کا بڑا حصہ ہے۔ وہ

نہایت خلوص کے ساتھ اپنی زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے کارناموں میں حسن فطرت کے جو پہلو بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں، اور عمل کی جو روح مضطرب دکھائی دیتی ہے اس سے توقع ہے کہ وہ جلد ہی لازوال شہرت حاصل کریں گے۔

جدید شاعروں کے کارنامے زیادہ تر، رسائل میں محفوظ ہیں! اس وقت صرف چند مجموعے شائع ہوئے ہیں جیسے "من کی بانسری" ۔"شیب و شباب" ۔" مزامیر" ۔ وغیرہ ۔ اور کچھ اب شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی اشاعت سے حیدرآباد کے جدید شعرا کی فکر کے متعلق بہت سے امور روشنی میں آسکیں گے۔

قدیم اساتذہ میں حضرت شاد، امجد، توفیق، کیفی، عزیز، جلیل، باقی (گردہاری پرشاد) حسرت (مولانا عبد القدیر صدیقی) نظم طباطبائی، ذہین مرحوم آزاد کے کئی کئی مجموعے اس وقت شائع ہو چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا جہاں جدید ترین اسلوب شعر کو فروغ دینے میں کوشاں ہیں، کچھ نوجوان ادیب، مشرق اور مغرب کے چوٹی کے شعرا کے کلام پر تنقیدیں ان کے نمونے، اور ان کے سوانح حیات کی اشاعت کی طرف بھی متوجہ ہیں۔ اس وقت اس طرح کی چند کتابیں مثلاً "ورڈسورتھ اور اس کی شاعری" ۔" ٹیگور اور اُن کی شاعری" "نغمات ہندی" ۔" براؤننگ" وغیرہ شائع کر کے ملک میں شاعری کے صحیح ذوق کو ترقی دینے میں مدد کر رہے ہیں۔

اُردو ادب کو ڈراما اور اس کے صحیح مفہوم سے روشناس کرنے میں بھی حیدرآباد کے ادیب ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی کوششوں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے " انجمن ترقی ڈراما" ۔" بزم تمثیل" اور "حیدرآباد ڈرامیٹک ایسوسی ایشن" اور چند ادارے برابر کام کئے جا رہے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتائج حسب ذیل ڈراموں کی شکل میں نمودار ہو چکے ہیں۔

" نئی روشنی" ۔" ظاہر باطن" ۔" حشرات الارض" ۔" فریب تخیل" ۔ صلائے عام" ۔" ہوش کے ناخن" ۔" غلط در غلط" ۔" نالن" ۔" مستقبل" ۔" کالج کے دن" ۔ خیام" وغیرہ۔

ان ڈراموں میں سے بعض مغربی شہ کاروں سے ماخوذ ہیں۔ اور اکثر ایک سے زیادہ دفع اسٹیج پر بھی کامیابی کے ساتھ پیش کئے جاچکے ہیں۔ یہ کام بڑی محنت ذوق اور سلیقے کا تھا، لیکن تجربہ کار ادا آموزوں، اور صاحب ذوق پیش کنندوں اور اداکاروں نے اس میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اس سے حیدرآباد میں ڈرامے کی ترقی کے لئے شاندار مستقبل پیدا ہوگیا ہے۔

بعض خوش فکر شاعر مغربی شہ کاروں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی سعی میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور سخن پرداز، جو جرمنی کے فلسفی شاعر، گوئٹے سے خاص طور پر متاثر ہیں اس کے شہ کار "فاؤسٹ" کے خیالات کو اپنے طور پر، اُردو میں نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کام جلد منظر عام پر آجائے گا۔

اصل ڈراموں کے علاوہ ڈرامے کے فن، اس کی تاریخ اور اس کے لوازم پر بھی کافی لٹریچر ہمارے ہاں پیدا ہوچکا ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط کتاب "اُردو اور ڈراما نگاری" شائع ہوچکی ہے، اور "جدید اُردو ڈراما" اشاعت طلب ہے۔

افسانہ، اور خاص طور پر مختصر قصہ، موجودہ ادبی اصناف میں سب سے زیادہ مقبول صنف ہے۔ اس میں بھی حیدرآباد کے ادیب مسلسل کام انجام دئے جا رہے ہیں۔ ان کے قصے ہندوستان اور حیدرآباد کے رسائل میں ہر روز شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کتابی شکل میں بھی چند مجموعے شائع ہوچکے ہیں، مثلاً "نظر کے دھوکے"۔ "محشرستان"۔ "کامیاب افسانے" وغیرہ۔ افسانے کے فن، اس کی تاریخ اور متعلقہ تنقیدی موضوعات پر پہلے پہل حیدرآباد ہی سے کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی شہ کار قصوں کے کئی مجموعے، راقم سطور ہی کی عمومی ادارت میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ "قدیم افسانے"۔ "چینی اور جاپانی افسانے"۔ "انگریزی افسانے"۔ "فرانسیسی افسانے" وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے ذریعہ مشرق اور مغرب کے بہترین قصوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بچوں کی دلچسپی اور مذاق کی بھی کئی کتابیں نظم اور نثر میں شائع ہوچکی ہیں۔ نظم میں "گلزار اطفال"۔ "چمن زار حکایات" اور نثر میں "راہ سعادت"۔ "اسباق الاشیاء"۔ "گلشن اخلاق" وغیرہ قابل ذکر

ادب لطیف اور مزاحیہ مضامین کے بھی کئی مجموعے اس دوران میں شائع ہوئے جن میں "مضامین فرحت" ہندوستان بھر میں مقبول ہیں۔ ان کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ اور شائع ہو رہی ہیں۔ اور ایک ایک جلد کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرے مجموعے "صدائے... "اور غنچۂ تبسم" ہیں۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے انتقال سے، اس شعبہ میں اُردو کے بہترین اہل قلم کی کمی واقع ہو گئی۔ وہ جتنے اچھے شاعر تھے، ویسے ہی بلند پایہ مزاح نگار بھی تھے۔ "...لہ" "نمائش" اور "مجلہ عثمانیہ" میں اُن کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں۔

اس عہد کے چند سفرنامے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً "حج امجد" اسلوب بیان اور متصوفانہ نکات کی بدولت مقبول خاص و عام ہے۔ "حج المعظم" (مولفہ قاضی سید عبد النفاع صاحب) بھی بے حد دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ "پردیس کی باتیں" "یورپ کی ڈاک" اور یورپ اور امریکہ کا سفرنامہ (مولفہ نواب ظہیر الدین خاں بی۔ اے (عثمانیہ) خلف نواب معین الدولہ بہادر) بھی انداز بیان اور معلومات کے اعتبار سے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

اس عہد مسعود کے ادبی آثار کا ذکر ختم کرنے سے پہلے، ان ادبی رسائل کا اجمالی ذکر بھی ضروری ہے، جو اس دوران میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد کافی ہے، لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کچھ عرصہ تک جاری رہنے کے بعد، بند ہو گئے۔ ان میں "تاج" "ترک عثمانیہ" "ذخیرہ" "افادہ" "ثمرۃ الادب" "اتالیق" "شعلہ" "الفنا" "نونہال" "تحفہ" "نمائش" "لسان الملک" "ارتقا" "ادیب" "مجلہ مکتبہ" اور "حسن کار" شامل ہیں۔ جو رسالے اب تک جاری ہیں وہ حسب ذیل ہیں "صحیفہ" "اُردو" "مجلہ عثمانیہ" "المعلم" "حیدرآباد ٹیچر" "الموسی" "مجلہ طیلسانیین عثمانیہ" "آئینہ ادب" اور "شہاب"۔

"صحیفہ" پہلے ماہوار رسالے کی صورت میں جاری ہوا تھا، لیکن جلد ہی روزانہ اخبار کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور اب تک برابر جاری ہے۔ رسالہ "تاج" اس عرصہ میں دو دفعہ جاری ہوا اور پھر بند ہو گیا۔ بعض اہم محققانہ مقالے جیسے "اُردوئے قدیم"

"معراج العاشقین" وغیرہ شائع کرنے کا اس کو فخر حاصل رہا ہے۔ "النسا" بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں عورتوں کی دلچسپی کے مضامین کے لئے مخصوص تھا۔ اور "نونہال" بچوں کی استعداد کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ "حسن کار" مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ اور ادبی اور حسن کاری کے مضامین اور افسانوں کے علاوہ ملک کے مشہور صناع، عبدالقیوم صاحب آرٹسٹ کی تصویروں کی وجہ سے بہت مقبول تھا کیپٹن اعجاز علی شہرت مرحوم، جو اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، اس کے خاص اہل قلم تھے۔ ہتیاروں اور سازوں وغیرہ پر ان کے پر از معلومات مضامین، جو ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ "حسن کار" ہی میں شائع ہوئے۔

موجودہ ادبی اُردو رسائل میں "اردو" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہندوستان بھر کی مرکزی انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن کا بلند پایہ سہ ماہی رسالہ ہے، اور اپنے محققانہ اور علمی مضامین اور پابندی اشاعت کی بدولت نہ صرف اُردو کے تمام رسائل میں ممتاز ہے بلکہ انگریزی کے اچھے رسالوں کا ہم پایہ ہے۔

"مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ کے طلبا کا سہ ماہی رسالہ ہے جو انگریزی اور اُردو، دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کی خاص شہرت اُن علمی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے ہے، جن میں جامعہ میں وضع کردہ علمی اصلاحات کا نہایت صحت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہ مضامین علم کے ہر نظری اور عملی شعبے پر حاوی ہوتے ہیں۔

"الموسی"، سٹی کالج کے طلبا کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا خاص نمبر جو یوم ولی کے سلسلے میں شائع ہو رہا ہے۔ اُردو ادب میں ایک اہم چیز ہوگی۔

مجلہ طیلسانئین عثمانیہ ابھی ابھی، گویا جوبلی کی یادگار کے طور پر شائع ہونے لگا ہے۔ اس میں زیادہ تر جامعہ کے فارغ التحصیل انشا پردازوں اور علما کے مضامین ہوتے ہیں۔ جامعہ کے مقالے بھی اس میں بہ اقساط شائع کئے جا رہے ہیں، جس کی بدولت، وہ تحقیقات جو الماریوں میں مدفون تھی منظر عام پر آجائے گی اور عدم واقفیت کی بدولت ایک موضوع پر کئی کئی مقامات پر کام ہونے کا جو خدشہ تھا وہ جاتا رہے گا۔ درخشاں عہد عثمانی کے محض ادبی کارناموں کا یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے، جس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہے۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی تاریخ پر طائرانہ نظر

از جناب مولوی ضیاالدین بیگ صاحب بی۔اے۔بی ٹی ناظر تعلیمات

و معتمد عمومی انجمن

اعلیٰحضرت قدر قدرت حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے عہد زرین میں خصوصاً سررشتہ تعلیمات میں جو نمایاں ترقی ہوئی وہ جشن سیمین ہمایونی کے موقع پر متعدد تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ بخوبی منکشف ہو چکی ہے۔ اساتذہ کی انجمنوں کا قیام اس ترقی کا ایک اہم جزہے۔ چنانچہ صوبجات گلبرگہ شریف، اورنگ آباد، ورنگل اور مستقر بلدہ میں انجمنیں قائم ہوئیں۔ یہاں انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا تذکرہ اور اس کی ترقی تاریخی نقطۂ نظر سے بے جا نہ ہوگی۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا قیام | یہ انجمن سنہ ۱۳۲۳ف میں بمنظوری و اجازت محکمہ سرکار جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و ضلع اطراف بلدہ کے قیادت میں قائم ہوئی۔ سنہ ۳۲ف کے اختتام پر انجمن کی پندرہ شاخیں تھیں جن میں سکندرآباد و بلارم کے مدارس بھی شریک تھے اور اراکین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی چونکہ مذکورہ بالا مدارس کا تعلق دفتر صدر مہتمی تعلیمات بلدہ سے نہ رہا اسلئے سنہ ۳۵ف کے اختتام پر انجمن کی تیرہ شاخیں رہ گئیں اور (۸۱۰) اراکین تھے۔

انجمن کے مقاصد | (۱) جملہ مدارس سرکاری و امدادی کے مدرسین کو علمی و عملی ترقی اور فن تعلیم کے جدید اصول اور طریقوں سے واقف کرانا۔

(۲) مختلف مدارس کے مدرسین کو یک جا جمع ہونیکا موقع دیکر ان میں باہمی اتحاد پیدا کرنا اور ان کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچانا۔

(۳) تعلیمی نقائص دور کرنے کے لئے مفید تحریکات انجمن کے مقرر کردہ اصول وقواعد کے لحاظ سے پیش کرنا۔

(۴) طلبار کے عمدہ اخلاق اور دماغی وجسمانی نشو ونما کے لئے سعی کرنا۔

معروفیات | ان مقاصد کے حصول کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے گئے:۔

(۱) انجمن کی مختلف شاخوں میں ماہانہ جلسے منعقد کر کے تقاریر اور مباحثے کرنے کے لئے مرکزی انتظامی کمیٹی نے مفید مضامین منتخب کئے جن پر مدارس میں مباحثے ہوے۔

(۲) سالانہ کانفرنس منعقد کر کے تعلیمی نمائش اور باغبانی کا مقابلہ مقرر کیا گیا۔

(۳) عام جلسے منعقد کئے گئے جن میں تعلیمی مضامین پر منتخب اور ممتاز ہستیوں نے تقاریر کیں۔

(۴) سہ ماہی رسالہ حیدرآباد ٹیچر جاری کیا گیا۔

(۵) کتب خانہ قائم کیا گیا جس سے اساتذہ مستفید ہوتے رہے۔

(۶) لائق اور تجربہ کار اساتذہ کی ذیلی کمیٹیاں مقرر کر کے تعلیم سے متعلق اہم وضروری مضامین پر بسوط رپورٹیں تیار کرائی گئیں۔

(۷) زاید نصاب معروفیات کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جو اساتذہ کو مفید مشورے دیکر مدد اور رہبری کرتا ہے۔

(۸) اساتذہ کے لئے کلب قائم اور آراستہ کیا گیا۔

(۹) کانفرنس کے ضمن میں مشاعرہ منعقد کیا گیا اور نمونے کے اسباق اور لاسلکی تقاریر کا انتظام کیا گیا۔

(۱۰) انجمن امداد باہمی قائم کی گئی۔

(۱۱) آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن کی کانفرنسوں میں شریک ہونے کے لئے نمائندے بھیجے گئے۔

(۱۲) کانفرنس کے مفید تحریکات کو بعد منظوری محکمۂ صدر پر بغرض کارروائی بھیجا گیا۔

سالانہ کانفرنس | انجمن کی پہلی سالانہ کانفرنس ۳۵ف میں زیر صدارت عالی جناب

حیدر نواز جنگ بہادر ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر اعظم بہادر باب حکومت منعقد ہوئی۔ دوسری کانفرنس کو ۱۳۳۷ف میں اور نویں کو ۱۳۴۵ف میں نواب مہدی یار جنگ بہادر ام۔ اے (آکسن) معتمد سیاسیات حال صدر المہام بہادر سیاسیات و تعلیمات کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۳۳۸ف میں تیسری سالانہ کانفرنس کی صدارت عالیجناب خان فضل خان صاحب ایم۔ اے آنرز کنگز ناظم تعلیمات نے اور چوتھی کانفرنس کی ۱۳۳۹ف میں نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد تعلیمات، عدالت، کوتوالی و امور عامہ نے فرمائی۔ ۱۳۴۰ف میں پانچویں کانفرنس کو مرزا یار جنگ بہادر میر مجلس عدالت العالیہ اور ۱۳۴۱ف میں چھٹی کانفرنس کو عالیجناب نواب سر نظامت جنگ بہادر نے صدارت کی عزت بخشی۔ ۱۳۴۲ف میں ساتویں اور ۱۳۴۴ف میں آٹھویں کانفرنس منعقد ہوئی جبکہ عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم۔ اے بار ایٹ لا معتمد تعلیمات، عدالت، کوتوالی و امور عامہ اور مسٹر اے ایچ میکنزی ایم۔ اے سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای پروائس چانسلر جامعہ عثمانیہ صدر نشین تھے۔ ۱۳۴۶ف میں دسویں کانفرنس بصدارت عالیجناب قاضی محمد حسین صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (کنٹب) نائب معین امیر جامعہ منعقد ہوئی۔ اس طرح اب تک انجمن کی دس کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں پہلے چار سال تک تقاریر کے علاوہ تعلیمی نمائش اور مفید تحریکات پر انجمن کی توجہ مرکوز رہی اس کے بعد سے تقاریر اور نمائش تعلیمی کے ساتھ ساتھ نمونے کے اسباق مشاعرہ، باغبانی کے مقابلے کو شریک کیا گیا اور گذشتہ کانفرنس کے موقع پر جبکہ تعلیمی ہفتہ منایا گیا اس میں لاسلکی تقاریر اساتذہ کے کلب کے ٹورنمنٹ اور ڈنر کا اضافہ کیا گیا۔ انجمن کی دسویں سالانہ کانفرنس یادگار رہے گی۔ جس کی تعلیمی نمائش کا افتتاح علیاحضرت شہزادی دُرِّشہوار دُردانہ بیگم صاحبہ پرنسس آف برار نے ازراہ عنایت فرمایا تھا۔

تعلیمی کانفرنس کانفرنس کے ضمن میں ہر سال تعلیمی نمائش منعقد کی جاتی ہے جس میں مدارس تحتانیہ و ثانویہ مستقر بلدہ کے اساتذہ و طلبہ کا منتخب سامان بھیجا جاتا ہے جن سے اُن کو تحریص ہوتی ہے اور اُن کی قابلیت اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہر سال متعدد انعامات دئے جاتے ہیں پیوستہ سال آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن منعقدہ ناگپور۔

(جس سے انجمن ہٰذا ملحق ہے) کی نمائش تعلیمی میں سٹی کالج اور مدارس بلدہ کو (۱۴) انعامات ملے۔

باغبانی کا مقابلہ ۱۳۴۳ف سے اس کا آغاز ہوا۔ اس سے مدارس بلدہ میں باغبانی کی ترغیب و تحریص ہو رہی ہے۔ پہلے سال ۷، دوسرے سال ۹ اور تیسرے سال ۸ مدارس نے مقابلہ میں حصہ لیا۔ مسلسل دو سال سے مدرسہ فوقانیہ نامپلی رولنگ کپ کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے مدارس وسطانیہ میں شاہ گنج اُردو شریف کو کپ ملا تھا۔ دیگر درد ھنی ہائی اسکول مدرسہ تحتانیہ خیریت آباد، ماڈل پرائمری سکول کے باغیچوں کی حالت اچھی ہے۔

عام جلسے انجمن نے اراکین کے مفاد کے لئے تقریباً ہر سال عام جلسے منعقد کئے جن میں ماہرین فن اور معززین نے جو حیدرآباد تشریف لائے تھے تقاریر کیں اس وقت تک جملہ (۱۰) جلسے منعقد ہوئے ہیں۔ معززین میں منجملہ دیگر اصحاب کے پروفیسر شیشادری، پروفیسر واڈیا، ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر ہیرلڈمن کے نام قابل ذکر ہیں۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر یہ دوماہی رسالہ تقریباً ۱۱ سال سے ملک کی تعلیمی خدمت کامیابی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ جس کا معیار شروع سے بلند ہے اور یہ غیر تجارتی اصول پر محض اساتذہ کے مفاد کی خاطر جاری رکھا گیا ہے۔ اس کے بانی اور مدیر مسئول جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) ہیں جن کی ان تھک کوششوں اور محنت و دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ رسالہ باوجود مالی مشکلات کے جاری رہا۔ اس کے ذریعہ انجمن کی مختلف مفید تحریکوں کو باہم مربوط رکھا جاتا ہے نیز اساتذہ کے احساس علمی کو بیدار کیا جاتا اور طلبہ اساتذہ کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کو شائع کرکے فن علمی پر نفسیاتی حیثیت سے تنقید و تبصرہ کیا جاتا ہے اس کے علاوہ مفید مضامین کی اشاعت سے انجمن کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلایا جاتا ہے۔ سررشتہ کی جانب سے ازراہ قدردانی مدارس ثانویہ اور تحتانیہ کے لئے اس کی متعدد جلدیں خریدی جاتی ہیں۔

ذیلی کمیٹیوں کی رپورٹیں انجمن نے اب تک بعد غور و خوض کے بعد مفید مضامین پر ۱۶ رپورٹیں تیار کیں جن میں اساتذہ کے خیالات تجاویز اور تجربے وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ حقیقی معنوں میں یہ رپورٹیں اساتذہ کے خیالات و جذبات کی ترجمان کہی جا سکتی ہیں۔

ان کی تیاری میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے کافی مدد فرمائی۔ یہ رپورٹیں انگریزی، اردو، ریاضی، عملی ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، السنہ قدیم، ڈرائنگ "سست ذہن طلبہ کی تعلیم"، جسمانی تعلیم، کنڈرگارٹن، امتحانات، زائد از نصاب معروفیات اور ضبط مدرسہ پر تیار کی گئی ہیں ان میں سے اکثر رپورٹوں کو بروقت صدر دفتر پر بھیجا گیا جہاں سے بعض رپورٹوں پر ضروری کارروائی کی گئی۔

کتب خانہ | تقریباً دس سال سے دفتر صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ میں انجمن ہذا کا کتب خانہ زیر نگرانی جناب مولوی سید علی اکبر صاحب قائم ہے جس میں فن تعلیم سے متعلق نہایت مفید کتب تقریباً (۷۰۰) انگریزی اور (۱۰۰) اردو مہیا کی گئی ہیں۔ کتب خانہ سے انجمن کا ہر رکن مستفید ہو سکتا ہے۔ محکمۂ نظامت تعلیمات سے سالانہ (مالت) امداد ملتی ہے۔ موزون کتب کا انتخاب اور کتب خانہ کا حسن انتظام جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کی ذاتی نگرانی اور گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

سنہ ۱۳۴۳ف میں عالیجناب مولوی محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات نے از راہ کرم تقریباً (۱۰۰) قیمتی کتب عنایت فرمائیں جس کی بنا پر جناب ممدوح کو دوامی رکن مقرر کیا گیا۔ نیز جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ریورنڈ ایف سی فلپ اور مسٹر دیبر نے پانچ پانچ اور ۳۰ کتب مرحمت فرمائیں۔

مالی حالت | آمدنی کا دارو مدار ماہانہ چندہ پر ہے جو اراکین سے مقررہ شرح کے مطابق وصول کیا جاتا ہے۔

اختتام | مذکورہ بالا واقعات و روئیداد کے لاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ انجمن اساتذہ بلدہ کے قیام کی شدید ضرورت تھی اور اس کے کارپردازوں نے اساتذہ کی خدمت کرنے میں امکانی کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہے، یہ کامیابی اس کے سرپرست عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات و عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات کی توجہ اور ہمدردی اور انجمن کے روح رواں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس انجمن کی بے لوث خدمات و ان تھک کوششوں اور مرکزی انتظامی کمیٹی کے اراکین کے

اتحاد عمل اور اُن معزز ہستیوں کی تعلیمی دلچسپی اور ایثار کا نتیجہ ہے جنہوں نے انجمن کی کانفرنس میں بحیثیت صدر نشین یا کسی دوسری حیثیت سے اُس کی کامیابی میں حصہ لیا عموماً ہر سر رشتہ کو اور خصوصاً سر رشتہ تعلیمات[1] اور انجمن ہذا کو اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ، کے مبارک زمانے میں جو نمایاں ترقی ہوئی وہ ذات شاہانہ کے علمی تبحر اور معارف نوازی کا نتیجہ ہے

الٰہی آفتاب ملم اعلیٰ حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی و شہزادگان والاشان اور شہزادیاں ہمایوں فال کو سلامت رکھ اور عرصہ دراز تک اپنی رعایا پر حکمراں اور سایہ فگن رکھ۔
آمین ثم آمین

الٰہی تا جہاں باشد شہنشاہ جہاں باشی خدایت مہرباں و تو بعالم مہرباں باشی

قطعہ تاریخ حیدرآباد ٹیچر جوبلی نمبر از جناب مولوی سید ولدار حسین صاحب اظہر

مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء

جان نثار علم و سلطان العلوم
یادگار جشن سیمین طرح سرو
بہر سن گفت اظہر فی البدیہ
تاج گاہ جشن سیمین طبع سرو

۱۳۵۵ھ

فقیر سید ولدار حسین اظہر
۱۹۳۷ء

[1] یعنے سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف
تمدن عرب
جو
مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ اور
نواب جیون یار جنگ بہادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے
عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی
مرحوم کے
سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۲۴) سادہ تصاویر (۲) نقشوں کے ہمراہ جسکی قیمت پچاس روپے
تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب
اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن و والی برار مدظلہ
کے جشن سیمین کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے قیمت صرف
۲۵ پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار
سید عبدالقادر اینڈ سنس
پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس
چارمینار حیدرآباد دکن

VOL. XI

No. 2.

THE HYDERABAD TEACHER

JANUARY—MARCH, 1937.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association Hyderabad-Deccan.

Under the Patronage of

Fazl Muhammad Khan Esq., M. A.

Director of Public Instruction.

Silver Jubilee Number

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab) *Editor-in-Chief.*

F. C. PHILIP, M. A.

SALIM BIN SAYEED, B. A., B. T., M. Ed. (Leeds).

T. A. LINGAM B. A., L. T.

SECUNDERABAD DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD

1937.

Annual Subscription Rs. 3.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space	Whole year B. G. Rs.	As	Six months B. G. Rs.	As	Per Issue B. G. Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page ...	6	0	3	8	2	0
Quarter page.	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs, 3 annually, (including postage).
For British India B. G. Rs 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B. G. As. 12 for British India.

The Urdu & English sections are published separately also, the annual subscription being Rs. 1 As. 14 & Rs. 2, respectively.

The Hyderabad Teacher

CONTENTS.

ERRATA.

Page 1 line 6 from bottom for "number scholars" read "number of scholars".
" 2 " 2 " " " "have brought" read "have been brought".
" 14 " 9 " " " "district" read "division".
" 15 " 19 " top " "of the Secondary" read "of Secondary".
" 36 " 3 " " " "As regards of the" read "As regards the".
" 38 " 2 " " " "feature" read "future".
" 53 " 13 " " " "sessions" read "session".

The Hyderabad Teacher

CONTENTS.

Our Benign Ruler

BY

F. M. Yusufuddin, M. A. (Leeds),
Lecturer, Osmania Training College.

The accession of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur to the throne marks the beginning of a Renaissance in the history of Hyderabad. Since then, His Exalted Highness and his officers have spared no pains to evolve a new order of things and develop Hyderabad into a modern State. As soon as His Exalted Highness ascended the *musnad*, he took every care to make himself thoroughly acquainted with the details of administration. He then created an Executive Council with Sir Ali Imam, a veteran statesman of British India and once the Law Member of His Excellency the Viceroy's Executive Council, as its President. As a result of His Exalted Highness' watchful and fostering care, Hyderabad has made steady progress in every branch of activity with which the State is concerned.

It is difficult to make particular mention of any one department when all departments are vying with one another in efficiency and good work. The Education Department, in which we teachers are especially interested, has made phenomenal progress and education has been brought within the reach of the masses. The educational budget 25 years ago was only 14 lakhs, but now it is more than a crore of rupees, while the number scholars has increased from 66,484 to 3,53,582. There were only two Colleges in Hyderabad in 1911, but now there are 10 Colleges (including the Professional Colleges). At present there is no district without a High School nor a Taluq without a Middle School, while the vast majority of villages are provided with either

Government or Local Fund Primary Schools. A number of schools have also been opened for the children of the so-called depressed classes and further facilities are also being provided for their education. A scheme of technical education will soon be enforced and the day is not faroff when primary education, which is now free, will also become compulsory.

The education of women has likewise received a great impetus during His Exalted Highness' reign. At present there is one first grade College and four High Schools for girls (besides two Convent Schools) in the City of Hyderabad alone, while two more High Schools have been recently opened, one at Aurangabad and one at Warangal. Several Middle Schools and a large number of Primary Schools are scattered all over the Dominions and in addition to these, there are a number of aided schools which are also doing excellent work.

The creation of a University with an Indian language as the medium of instruction would have been impossible but for the generosity and foresight of His Exalted Highness in matters educational. This bold experiment has more than justified itself, and there are definite signs that the example set by Hyderabad will be followed in other parts of India also at no distant future.

The progress of other departments has been equally remarkable. The budget of the Public Works and Irrigation Departments in 1320 Fasli was only fifty lakhs of rupees; in 1344 Fasli it rose to one crore and forty-three lakhs. Formerly, the lack of good roads was a great obstacle in the way of the economic development of the State. But now thanks to the construction of three thousand and twenty-five miles of good *morum* roads and two hundred and forty-eight bridges and the rapid improvement in the means of communication, even the most remote places have brought within easy reach of the capital.

The City Improvement Board has spent about two crores of rupees in improving the City of Hyderabad in every possible way in recent years. Consequently, there are few cities in India to-day that can stand comparison with Hyderabad. The roads have been widened and made dust proof; parks have been laid out and provided with greater amenities than hitherto; and a central market has been established. But of greater importance than all these perhaps has been the attention given to the needs of the poorer classes. Slum clearance work has been undertaken in no less than fourteen different localities at a cost of about fifty lakhs of rupees and about 2,500 houses have been constructed for housing ten thousand citizens. Children's parks and infant welfare centres have brought a measure of happiness to the poor which was formerly denied to them. The beautiful and imposing buildings that adorn the city of Hyderabad to-day, the High Court, the Osmania Hospital, the Unani Dawakhana, the State Library and the Jubilee Palace, are striking examples of His Exalted Highness' exquisite taste in architecture. The Osmania University buildings at Adikmet, when completed, will be another great monument of His Exalted Highness' glorious reign.

Another feature of the material progress made by the State during the last quarter of a century is the materialisation of irrigation projects on a gigantic scale The Nizam Sagar alone has brought more than three lakhs of acres of land under cultivation and has made famine and scarcity of water in these areas a thing of the past. When the Tungabhadra project, which is under contemplation, is completed, the risks of famine in the Raichur district also will be obviated.

The opening of the various experimental farms and the employment of experts show the interest of His Exalted Highness in agriculture, which is the main occupation of the people of this State. Considerable help has also been given

to the cultivators in the form of Taqavi and legislation has been passed to make their lands secure for them and to save them from the clutches of money-lenders.

His Exalted Highness has always attached great importance to the development of local industries. The founding of a Trust Fund amounting to a crore of rupees is a sure guarantee of the bright future that awaits them.

One of the most important and far-reaching reforms introduced by His Exalted Highness is the separation of the Judiciary from the Executive.

The activities of the Medical Department have been considerably enlarged: medical relief has been extended to the remotest parts of the State; special departments such as those of plague and malaria have been opened; and now steps are being taken to establish a tubercular sanatorium and a children's clinic.

Electricity is another blessing of His Exalted Highness' benevolent rule. There is electric supply not only in the city of Hyderabad but also in important places like Aurangabad, Raichur, and Warangal, while these as well as Parbhani, Gulburga, Jalna, Nanded, Latur and Nizamabad have been provided with a fresh water supply at a considerable cost.

The Hyderabad State owns 1300 miles of railroad. There is also a State-managed motor transport service, which is co-ordinated with the Railway Service, though it is primarily intended for places untouched by the Railways. In this way, the inhabitants of the remotest parts of the Dominions have been brought into closer touch with the capital and with the new life and ideas that characterise it. The linking of Hyderabad with the Karachi—Bombay—Madras Air Line and the inauguration of Wireless Broadcasting are other notable developments which have taken place in recent years.

The materialisation of the works of public utility mentioned above has been made possible by the sound finances of the State. The State is fortunate in possessing a financial genius like the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur, KT., P.C., L.L.D., who has produced a series of surplus budgets even in times of economic depression and has done so without either increasing the burden of taxation or checking the development of the various departments. It is mainly due to his outstanding financial ability that the credit of the State stands so high to-day.

It is incredible to believe that so much progress could be made and such far-reaching changes could be effected within the space of a quarter of a century. Great and unequalled as His Exalted Highness is as a Ruler, even greater is he as a man. The simplicity, purity and austerity of his private life have become proverbial. Though the ruler of a great historic kingdom, the premier Prince of India and perhaps the richest man of the world, he spends much less on his own person than many a man in his exalted position would have done; but where the welfare of his people, or of humanity in general is concerned, his generosity knows no bounds. Not a scheme that had for its object the ultimate good of his people was ever submitted to him that did not meet with his prompt approval. His generosity crosses the insular boundaries of race and nation and no deserving institution either in India or outside India ever applied to him for help in vain. Educational and other useful institution in British India receive a grant of nearly Rs. 2 lakhs every year.

Reference has already been made to His Exalted Highness' abiding interest in education. An eminent poet and profound scholar himself, he has given his gracious patronage to learning, and the intellectual activity which has characterised his reign, has been largely due to his inspiration. He is rightly called Sultan-ul-Uloom. By confer-

ring this title on him the Osmania University has honoured itself.

His Exalted Highness dislikes ostentation both in private and public affairs. For this reason he disapproved of the programme that was originally drawn up to celebrate the Silver Jubilee and ordered that as little as possible should be spent on the various functions connected with it and that the money thus saved should be utilised for works of public welfare. In reply to the address presented by Prince Wala Shan Nawab Moazzam Jah Bahadur as President of the City Improvement Board, after praising the good work done by the Board, His Exalted Highness was pleased to give a piece of advice, which will ever be written in letters of gold. "The Board" he said, "should see that its time and labours are devoted to the clearance of slums and the better housing of the poor rather than to works that are meant for mere show and display".

Both by precept and example His Exalted Highness tries to guide his people in the right direction, and thus he is not only their benevolent ruler but their trusted leader. He is, in a real sense, the friend, philosopher and guide of all his subjects, including the aristocracy. His zeal for socio-religious reform is well known; he has succeeded in eradicating many evils which had crept into the social life of the people in the guise of religion.

His Exalted Highness has a deep solicitude for public welfare and entertains a lofty conception of his duties as a Ruler. In his reply to the address which was presented to him by His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur on behalf of His Exalted Highness' loyal subjects on the occasion of the Silver Jubilee, His Exalted Highness remarked in a tone of utter sincerity, "I look upon this kingdom as a solemn trust which has been handed down to me from my great ancestors, and I assure you that my life is dedicated to the welfare of my people. To be their

servant is a source of pride and distinction to me". It is because of ideals like these that he is able to rule over the hearts of his people.

A true and sincere friend of the poor, His Exalted Highness has always shared their joys and sufferings. Whenever an epidemic breaks out in any part of the Dominions, every help is given to those who need it and the Medical Department leaves no stone unturned to bring it under control. Whenever the crops are bad, the agriculturists are sure to get a substantial remission of their rent. These remissions have become continuous for the last three or four years, culminating in the recent announcement of a further remission of forty lakhs of rupees on the happy occasion of the Silver Jubilee. His eagerness to expedite slum clearance work and the opening of schools for the depressed classes are other instances of his great concern for the poor. His profound sympathy with the people found striking expression when a disastrous fire broke out in the Moti Mahal Cinema last year. He at once visited the scene of the tragedy and appointed a Commission to inquire into the causes of the disaster and to suggest measures for preventing such disasters in the future.

True to the great ideals of Islam, he believes in the equality of all and loves his subjects irrespective of class or creed The latter characteristic, as a matter of fact, has been the distinguishing feature of the Great Asaf Jahi dynasty, for none of the Rulers ever made a distinction between their subjects on communal grounds but treated them all alike. Hence it is that Hyderabad has had glorious traditions of communal peace and harmony for centuries past and is still a model for the rest of India.

When so deep and genuine is the love of the Ruler for his people, and so exalted his conception of his trust, is it a wonder that his fourteen million subjects with one mind and soul are jubilant over the completion of the 25th year

of his glorious reign and invoke the blessings of God on him and his family and pray that he may be spared to rule over them for many more years to come and that they may have the privilege of celebrating his Golden and Diamond Jubilees also?

Long live our Benign Ruler! Long live the Nizam!

Presidential Address

Delivered at the Tenth Session of the Hyderabad State Women's Conference

BY

Her Highness the PrincessDurru Shevar of Berar.

LADIES,

It gives me great pleasure to be in your midst today. As Hyderabad is now my home, I identify myself with all your hopes and interests, your ambitions and aspirations, and the welfare of your children. Ever since I came here, I have waited for the time when you would consider me as one of yourselves and believe that I am always ready to co-operate with you in every way that will help to attain your happiness. Therefore, I consider this indeed a felicitous occasion on which I can express my true feelings and let you be the judge of the sincerity of my sentiments.

I have the greatest admiration and the deepest concern for the women of India: admiration for their unlimited patience and infinite courage, concern for the well-being of their present and future life. To-day, women all over the world are awakening to the sense of their responsibility and privilege in shaping the destinies of coming generations. Indian women, who have so much to give because they have inherited the Indian ideals of loyalty, devotion, proud modesty and graciousness, should be in the forefront in con-

tributing to the Service of Humanity. To-day, women, in almost every civilized country of the world, are no longer parasites of dependence but citizens of the soil that has bred them—with the right to exist, to take and to give; with the right to add to the honour of their nation and the ethos of their people; with the courage and knowledge to exalt and develop the common cause of progress! These inalienable rights should equally belong to the Womanhood of India.

The fetters of ignorance and of the past have bound us to the belief that religion is a retrogressive factor and that modesty can only be retained within the darkened limits of our inactivity. Yet, every religion was born to lead us upon the right path of evolution, to endow us with faith and fortitude and save us from the ignominy of ignorance.

I am proud that in this last respect we, the women of Hyderabad, need not merely boast but can justly lay claim to our share, however small, of cultural enlightenment. Very few states have women's colleges. It is with a sense of gratification that I can mention the Osmania University College for Women which has lately shown such brilliant results, and the Mahbubia which is a model institution. The Women's Association, also, deserves our congratulations for so earnestly seeking to meet the increasing demand for mass education through the medium of its four free schools in poor areas. But, you will all agree with me that these and a few others are not enough to supply all needs. There are thousands within the Districts who are beyond the reach of this life-giving light. It must spread: it must be like sunshine available to all; available alike to rich and poor. Here we see the necessity of making Free Primary Education in our Dominions as *universal* as practical considerations will possibly allow. The present system should be suitably revised and re-organized, especially in view of the problem of our educated unemployed. A significant step in the direction of reforms has already been taken by

the Hyderabad State Educational Enquiry Committee. I greatly appreciate this move and hope that their effort will be fruitful.

It is a saying of Hazrat Mohammed, who is the Prophet of God for four hundred million Moslems and a sublime Truth-giver to humanity, that: "*Superiority in Knowledge is better than superiority in Worship.*" It is yet another Hadis that in its farseeing wisdom commands us to "*Seek even as far as China.*" The beautiful and peace-giving philosophy of Hinduism has inspired equally elevated doctrines on the value of wisdom and learning. However, mere book-learning is not sufficient: it is but a fragment of that vast, immeasurable education which ought to banish narrow-mindedness, create sympathy, understanding, and eradicate superstition, prejudice and fear.

It was a sage utterance of a great man that "Mothers make the Nation," because the standard of a nation is judged by their standards; because the first teacher of a child is his mother; and unless the mothers themselves are enlightened and have acquired high qualities, character and ideals, they are incapable of bringing up the rising generations. Can we question the sagacity of the Hadis that: "*No present or gift of a parent to a child out of all the presents and gifts is superior to a good, liberal education.*"

The extreme delicacy and importance of the duty of Teachers, also, is not always adequately comprehended. Their errors are not like the mistakes of clerks that can be corrected and remedied. Their satisfaction must be sought in moral recompense and results rather than in the gain of material reward.

The aim of all training is to prepare the young to be useful citizens. So may our youth be trained to serve, with excellence, their Country and their benevolent Ruler whose own lofty ideas and noble words convey to us his boundless concern for them! There is a quality of greatness and

immortality in his message; at the same time we are touched by his affectionate sincerity and simplicity that will make us remember it for ever with reverence and gratitude: "*I have ever kept in view the measures that promised to secure the happiness and prosperity of my beloved subjects in whose contentment and advancement my interest is paternal and abiding.*" Surely it is in loyalty, devotion and also in utility that we find the appropriate answer to this inspiring sentiment.

Another problem which is seriously challenging the attention of India is that of the economic independence of its women. They must be taught the dignity of work. Every woman ought to be in a position to support herself by means of an honourable livelihood should the occasion arise. It is a matter of pride and not of humiliation to add to the meagre family income by one's own endeavour.

The proposed scheme for an Arts, Crafts and Home Industries Institute for women in Hyderabad is most admirable. It will not only train them in the science of Production, but by marketing their goods it will help to solve, partially at any rate, the vexatious question of Unemployment—particularly amongst the middle classes to whom the yoke of the purdah system denies the opportunities which their financial circumstances demand.

Is it not unfortunate that the majority of Indian women are not brought up with the idea of 'self-dependence' and therefore lack the essential element of life which is self-respect? There is too much 'protection' and dependence upon externals. There is not that inner anchor of poise, stability and assurance which comes from the capacity of self-realization. The individual seeks self-perfection in the perfection of his people, and his spirit finds its own reflection in the immortality of the National Being. Consequently, we may best hope to attain our self-realization as useful and integral members of that Social Whole. India has produced illustrious and distinguished women in all depart-

ments. Few professions in this generous land of ours are closed to us. The limit to the achievement of the Indian woman is set chiefly by her own ambition and ability. Let your ambition strive to remove the legal and social disabilities that stand in your way: let your ability prove the supreme justification of that removal.

I am happy to see that the ancient Hyderabadi tradition of intercommunal concord and friendship is a living reality among the women of our Dominions. I trust that this spirit will continue to grow, manifesting itself in greater and truer appreciation of one another's creeds, cultures, beliefs, and in close co-operation and comradeship that will help the onward march of their united efforts.

Now I have come to the last of my few suggestions, one which I consider most vital because it deals with the personality of a people. Personality is a thing that cannot be bought or acquired with gold, position or power. It is a thing that grows with the history of a nation. For this reason I am sorry to observe the introduction, in the name of progress, of many useless and sometimes harmful elements that are, in essence, contrary to Indian characteristics. A discriminate acceptance of Western or any other culture is good, but blind imitation that leads to futile and sterile mediocrity is greatly to be deplored. The rational revival of our own culture would be purposeful and productive; while we must welcome knowledge and new ideas from whatever source they come, our advancement in all directions must be rooted in the best traditions and ideals of the land. The application of foreign ideas should be in accordance with our needs, circumstances and methods of life. Hence must we, the women of this country, treasure our precious birth-rights of spiritual grace and graciousness, the Eastern qualities of consideration and courtesy, and destroy for ever the meaningless superstitions, prejudices and fears invented by our ignorance and augmented by our idle imaginations!

We must turn now to the purpose for which we are assembled here today. A heartfelt prayer shall be my last word as it was my first thought.

Let your deepest concern be for the health of your minds and bodies. Let your persistent thought be for your goal in life which is the reason of your being. Have confidence in yourselves and in your capacity. Let there be a meaning to your existence so that it will be remembered with respect and reverence by your children and their children.

May God give you all Peace, Happiness, and the Contentment of Achievement!

Educational Progress Under Asaf Jah VII*

BY

Syed Ali Akbar, M. A. (Cantab)

It is necessary to know something of the history of education in the Hyderabad State before 1911 to be able to appreciate the progress in education which has been achieved during the glorious reign of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan, Asaf Jah VII, G. C. S. I., G. B. E., Sultan-ul-Uloom, Nizam of Hyderabad and Berar.

The first step towards public instruction was taken by the great statesman Sir Salar Jung in 1853, when he founded the Darul Uloom, which was to be a centre of Oriental learning. The Education Department was created in 1868, and by 1883, when Mr. Syed Husain Bilgrami, B A. (afterwards Nawab Imadul Mulk Bahadur, C. S. I.) was appointed Director of Public Instruction and Educational Secretary, education had come to be recognised as an important function of the State. To him is due the credit for organising the Department on modern lines. One of his earliest measures was to appoint an Inspector for each Subah with a Nazir under him for each district. He extended the facilities for Secondary and Primary Education in the districts by establishing a High School at the headquarters of each district and a Primary School in every well-populated village. At Headquarters, the City High School, the Chaderghat High School and Aided High Schools like St. George's Grammar School (founded in 1834), the Mahboob College and the All Saints' Institute were greatly developed; the Hyderabad College was amalgamated with the Madrasa-e-Aliya and the institution came to be known as the Nizam College, a first grade college affiliated to the Madras University; and the

*This article is based on 'Education under Asaf Jah VII', a book recently published by H. E. H. the Nizam's Education Department on the occasion of the Silver Jubilee.

Darul Uloom improved in strength and efficiency, especially after its affiliation to the Punjab University for the Oriental Titles Examinations. Equally satisfactory was the progress achieved in the sphere of Professional and Technical Education. The Normal School at Hyderabad was reorganised and an Engineering School, a Medical School, a Law School and some Industrial Schools were also opened. There were in 1882-83 only 186 institutions with not more than 11,599 pupils and an educational budget of Rs. 1,53,160; by 1905-06, the number of schools had increased to 882, the number of scholars to 59,821 and the expenditure to Rs. 10,31,255.

In 1907 shortly after Mr. Syed Sirajul Hasan, M. A., B. C. L., L. L. D. (now Nawab Siraj Yar Jung Bahadur), was appointed Director of Public Instruction, the State was obliged, as a result of the passing of the Indian Universities Act, to disaffiliate the Darul Uloom from the Punjab University and to institute its own Oriental Titles Examinations. There were then the following types of the Secondary Schools in existence :—

1. *Faukania Schools*—These were Oriental High Schools preparing pupils for the Munshi and Moulvi Examinations. English was taught as a second language.

2. *Rooshdia Schools*—These acted as feeders to the Faukania Schools and prepared pupils for the Rooshdia Examination.

3. *English High Schools*—Preparing pupils either for the Matriculation Examination of the Madras University or for the Cambridge Local Examinations.

4. *Anglo-Vernacular Middle Schools*—These were feeders to the English High Schools and prepared pupils for the Middle School Examination, which was instituted by the State in 1890-91.

The introduction of the High School Leaving Certificate Scheme in 1911 gave an impetus to English education,

which had suffered for many years from the cramping influence of the Madras Matriculation Examination. A few schools, notably the Mahboobia Girls' School, founded in 1907-08, and St. George's Grammar School, however, continued to prepare their pupils for the Cambridge Local Examinations.

Dr. Syed Sirajul Hasan took a keen interest in industrial education. Three Local Fund Industrial Schools were opened between 1907 and 1909, one at Nizamabad, one at Bidar and one at Narayenpet. Another question to which he devoted special attention was the construction of school buildings. At his suggestion, in 1907-08 Government sanctioned a four years' programme for the construction of school buildings at a cost of 3 lakhs of rupees.

Educational Progress from 1911 to 1935.

With the accession of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, Asaf Jah VII, we come to a period of intense educational activity. Two important events had paved the way for this activity. The first was the appointment of Mr. A. T. Mayhew, M. A. (Oxon), I. E. S., as Educational Advisor in 1910 for a period of two years, and the second the appointment of Mr. A. Hydari, B. A. (now His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, P. C. L. L. D.), as Home Secretary in 1911. In the able and comprehensive report which Mr. Mayhew submitted at the end of 1911, he made valuable suggestions for the expansion and reorganisation of Primary and Secondary Education as well as for the reform of the administrative machinery of the Education Department, but it was left to His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari finally to shape the educational policy of the State. As Home Secretary, not only did he bring the Osmania University into existence, but he gave a vigorous lead to Primary and Secondary Education, as a perusal of his masterly reviews of the annual administration reports of the Education Department will show. Nor did

his interest in education diminish after he became Finance Member. Indeed, as subsequent events proved, his appointment as Finance Member was as distinct a gain to education as to the finances of the State.

Those who have held the office of Director of Public Instruction during the period 1911 to 1935, have each made a special contribution to the cause of education in the State. Mr. Alma Latifi, M. A. L. L. D., I. C. S., who succeeded Dr. Syed Sirajul Hasan in 1913, improved the internal organisation of the Department and took steps for the expansion of Primary Education on the lines suggested by Mr. Mayhew. Sir Ross Masood, B. A. (Oxon), L. L. D. (Nawab Masood Jung Bahadur), who was in charge of the Department from 1916 to 1927, speeded up the progress of education in all directions and left a brilliant record of work, the number of schools and scholars having trebled during his tenure of office. To Mr. Fazl Muhammad Khan, M. A. (Wrangler), the present Director, is due the credit for consolidating the progress made in previous years, for developing Secondary Education on more efficient lines and for introducing vocational instruction in a number of schools.

Thanks to His Exalted Highness' gracious patronage of learning and his deep and abiding interest in education, there has been, during his illustrious reign, a phenomenal development in all branches of education—University, Secondary, Primary, Vocational and Industrial Education, Women's Education, Education of the Depressed Classes, Adult Education, Physical Education, the Boy Scout and Girl Guide Movements, and the Training of Teachers. The Inspectorate has also been strengthened and reorganised. I shall now proceed to give a brief account of the progress of education under the above-mentioned heads.

University Education.

The Osmania University—The Oriental Titles Examinations instituted by the State in 1907 never became

popular, and the strength of the College classes of the Darul Uloom gradually declined until it reached the low figure of 22 in 1914-15. Since his appointment as Home Secretary, Mr. A. Hydari (now His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari) had felt the need for a radical reform of higher education. In 1917 he submitted a memorandum to His Exalted Highness pointing out the inherent defects of a system of education through the medium of a foreign language and recommending the establishment of a University, to be known as the Osmania University, with Urdu, the official and most widely-understood language in the State, as the medium of instruction and with English as a compulsory second language. With his foresight in educational as in other matters, His Exalted Highness at once saw the advantages of such a University and was graciously pleased to issue in the same year a *Firman* sanctioning the proposal. The first step towards bringing the University into existence was taken in 1918 by establishing a Translation Bureau with the object of getting text-books in the various subjects of instruction translated into Urdu. Within five years the Bureau completed the translation of nearly all the books required for the Matriculation, Intermediate and B. A. Examinations. The Osmania University College was formally opened in 1919. While the School Section of the Darul Uloom became an Osmania High School preparing pupils for the Osmania Matriculation Examination, the College Section was merged in the Faculty of Theology, which was opened in 1919-20. The first Matriculation Examination was held in 1918, the first Intermediate Examination in 1921, and the first B. A. Examination in 1923. The Oriental Titles Examinations finally disappeared in 1924.

As had been anticipated, the inauguration of the Osmania University led to a rapid development of higher education. In order to meet the growing demand for such education, Intermediate classes had to be opened in the City High School and the Aurangabad High School in 1923, in

the Zenana High School, Nampalli, in 1924, in the Warangal High School in 1927 and in the Gulburga High School in 1931. By 1927, besides the Faculties of Art, Science and Theology, those of Law and Medicine had been created. The Faculties of Engineering and Education were opened in 1929. In 1931-32 the Nampalli Zenana Intermediate College was raised to the status of a First Grade College and became known as the Osmania University College for Women.

His Exalted Highness the Nizam was graciously pleased to lay the foundation-stone of the new University buildings at Adikamet in June, 1934. The estimated cost of these buildings is about a crore and a half of rupees. In the same year, the Arts College, the Engineering College, the University Office and the Translation Bureau were shifted to temporary buildings at Adikamet constructed at a cost of nearly Rs. 11 lakhs. This was followed by a remarkable development in the corporate life of the University, especially after the construction of two permanent hostels with accommodation for over 300 boarders. Another important change which took place in 1934 was that on the retirement of Mr. Abdur Rahman Khan, B. Sc. (London), the post of Principal was abolished and Mr. A. H. Mackenzie, M. A., D. Litt., C. S. I., C. I. E., was appointed to the newly-created post of Pro-Vice-Chancellor.

There were in 1934-35, 9 Colleges under the University with a total strength of nearly 1,379 of whom over 75 per cent. were in the Faculties of Arts and Science. The total expenditure that year was over Rs. 20.5 lakhs.

The Nizam College—The establishment of the Osmania University did not in any way affect the policy of the Government towards the Nizam College. This institution has been maintained with unimpaired efficiency for the benefit of students who prefer the English medium. The strength of the College in 1910-11 was only 84; it increased

to 151 in 1914-15, to 285 in 1926-27 and a few years later to over 300, until in 1934-35, as in the case of the Colleges under the Osmania University, it was felt necessary to impose a restriction on the numbers to be admitted each year, the limit fixed being 300. B. Sc. classes were opened in 1920-21 and a year later a spacious building was constructed for the Science Department at a cost of Rs. 3 lakhs. The year 1923-24 saw the opening of a B. A. Hons. class. Women students began to be admitted to the College in 1929-30. The results of the College in the B. A., B. Sc. and Intermediate Examinations of the Madras University have been uniformly good since 1917. The expenditure, which in 1910-11 was Rs. 96,000, had risen to nearly Rs. 2,36,000 by 1934-35.

Secondary Education.

Neither the Faukania Schools nor the Rooshdia Schools proved a success. Therefore, in 1915 Dr. Alma Latifi, the then Director of Public Instruction converted all the Rooshdia Schools and seven out of the ten Faukania Schools into Vernacular Middle Schools.

The inauguration of the Osmania University in 1917 necessitated a complete re-organisation of Secondary Education. The entire curriculum of Secondary Education was revised and adjusted to the new needs in 1921. High Schools were classed under two heads—English High Schools and Osmania High Schools. The former, with English as the medium of instruction in the Middle and High Sections, were to follow, as before, the course of studies prescribed under the Regulations laid down by the Madras University for the H. S. L. C. Examination, while the latter, with Urdu as the medium of instruction throughout and English as a compulsory second language from Standard III onwards, were to prepare students for the Osmania Matriculation Examination. With the introduction of English as a compulsory subject in all Secondary Schools, the old

distinction between the Vernacular Middle Schools and the Anglo-Vernacular Middle Schools vanished. Most of the Anglo-Vernacular Middle Schools preferred, however, to change the medium of instruction from English to Urdu.

The establishment of the Osmania University, coupled with the rapid expansion of Primary education which had preceded it, led to a large increase in the demand for Secondary Education. Government therefore definitely adopted the policy of providing the headquarters of each district with a High School and as many Taluk headquarters as possible with Middle Schools. In pursuance of this policy 27 Middle Schools and 22 High Schools were established between 1915-16 and 1926-27, while 22 more Middle Schools and 11 more High Schools were added between 1927-28 and 1934-35. Among the High Schools opened in the former period was the Jagirdars College, a residential school intended for the sons of the landed gentry and maintained out of a cess collected from the Jagirdars in proportion to their revenue. This institution was founded in the year 1923-24.

Steps were taken at the same time to raise the standard of efficiency in Secondary Schools. From 1914 onwards men of high qualifications on a salary of Rs. 500—1,000 were appointed heads of important High Schools like the City High School, the Chaderghat High School and the Aurangabad High School. The City High School was provided with a magnificent building in 1921-22 at a cost of Rs. 9 lakhs. New buildings, for over two dozen other Government Secondary Schools, were also constructed according to standard plans, between 1926-27 and 1934-35. The creation of Divisional Inspectorships in 1918-19 brought about a more effective supervision of Secondary Schools. The teaching staffs were considerably improved. At first a certain number of Graduates and Intermediates were sent to British India for training every year. Later, when arrangements were made at Hyderabad for training

Matriculates, Intermediates and finally Graduates, there was a rapid increase in the number of trained teachers in the Secondary Schools, while the enhanced scale of salaries sanctioned under the Time Scale in 1920-21 helped the Department in attracting a better type of men for service as teachers in such schools. At the same time, under the new Grant-in-aid Code, which was introduced in 1921-22, Aided Secondary Schools were enabled by increased grants to improve their teaching staffs and equipment.

Mr. Fazl Muhammad Khan, who was appointed Director of Public Instruction in December, 1928, was anxious to give a practical bias to education. Within a short time, he succeeded in introducing vocational instruction in a number of Secondary Schools. He also carried out two other important reforms. The first was the abolition of the Middle School Examination, which had outlived its usefulness, and the second the revision of the curriculum. The new curriculum, which was introduced in 1931, affected all grades of schools, more especially the Osmania High Schools. With a view mainly to raising the standard of English, the course for the Osmania Matriculation Examination was extended from two to three years and was thus brought into line with the H. S. L. C. course. Elementary Science, Indian History and Geography were introduced as compulsory subjects for the Osmania Matric as well as the H. S. L. C. courses. Moreover, the syllabuses in these and other non-language subjects for both the examinations were made more or less uniform. The next logical step would have been to adopt a common system of examination, giving the candidates the option to answer the question papers in these subjects either in English or Urdu. A resolution recommending the adoption of such a common system was moved by Mr. Syed Mohamed Azam, M. A., (Cantab), B. sc., Principal, City College, at the Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held in 1928, and it was carried by a large majority.

The scheme proposed by him contemplated the creation of a Controlling Board, consisting of representatives of the Education Department, the Osmania University, the Nizam College and the public. Summing up the discussion, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, M. A., (Oxon), President of the Conference, rightly remarked, "While our energies are now divided, under the system proposed by Mr. Azam, they will be concentrated and will consequently produce better results." A Committee consisting of representatives of the Osmania University and the Education Department had already been appointed by Government to consider the question of amalgamation, but the difference of opinion among the members was so great that the question had to be shelved, until it was reopened in 1934 by the late Dr. A. H. Mackenzie.

After the abolition of the Middle School Examination in 1928-29, a Departmental Examination was instituted for those intending to qualify themselves for service in the Education Department as teachers in Primary Schools.

The following table shows the number of various types of Secondary Schools and their strength in 1910-11 and 1934-35 :—

	1910-11.		1934-35.	
	Schools	Scholars	Schools	Scholars
Middle Schools	64	10,408	130	41,318
Faukania „	10	2,045	—	—
English High Schools	14	3,873	29	14,718
Osmania „ „	—	—	25	13,807
Total ...	88	16,326	184	69,843

It will be seen from the above table that since 1911 the number of Secondary Schools has more than doubled while their strength has more than quadrupled.

Of the 29 High Schools classed as English High Schools at present, six, viz. the Government City Collegiate

School, Hyderabad, the Government Collegiate Schools at Warangal, Gulbarga and Aurangabad, the Government Zenana Collegiate School at Hyderabad and the Nutan Vidyalaya, Gulburga, are combined High Schools preparing pupils both for the Osmania Matriculation and the High School Leaving Certificate Examinations. The number of High Schools which prepare pupils for the Cambridge Local Examinations is only 6; all the other English High Schools follow the courses prescribed by the High School Leaving Certificate Board.

The total expenditure on Secondary Education in 1931-35 was Rs. 30,96,262 as against Rs. 4,70,509 in 1910-11.

Primary Education.

The progress of Primary Education was very slow till 1915. Recognising the vital need for a rapid expansion of Primary Education, Mr. (now Sir) Ross Masood, who was appointed Director of Public Instruction in 1916, set out with the aim of providing, within as short a time as possible, each village having a population of more than 1,000 with a school. The steps which were taken to carry out this aim were: (a) the opening of Local Fund Schools of the Experimental type, in accordance with the scheme formulated by Mr. Mayhew, and (b) the conversion of thriving Local Fund Schools into Shahi Schools. Thanks to the liberal annual grants made by the Government from 1915-16 to 1921-22, for the expansion of Primary Education, there was an increase of 3,080 Primary Schools and of nearly 1,42,000 pupils during these years.

The year 1921-22 is memorable in the history of Primary Education in these Dominions, because in that year with the object of bringing the benefits of education within the reach of the poorest of his subjects, His Exalted Highness the Nizam was graciously pleased to issue a *Firman* making instruction in all Primary Schools free.

After 1922-23, owing to the financial stringency, schemes for further expansion of Primary Education had to be suspended and for the next eight years the energies of the Department were directed more towards consolidation of the progress already made than towards the opening of new schools. Schools which had shown little or no promise were closed down and the money thus saved was utilised for strengthening deserving institutions. The sanction of the Time Scale, under which the minimum salary of the Primary teacher in a Government School was raised from Rs. 15 to Rs. 30 per mensem, greatly helped to raise the standard of efficiency in the Shahi Primary Schools. Steps were also taken to increase the supply of trained teachers. Finally, the new curriculum which was introduced in 1930-31 made the Primary Schools more popular, because it brought the courses of study in them into closer relationship with the life and surroundings of the pupils.

In 1932 an Experimental School called the Model Primary School was opened at Hyderabad with the object of providing an opportunity for experiments in the field of Child Education. In the same year the Department renewed its efforts at expansion. No fewer than 219 Schools were added in that year. Of these 94 were Government Schools, and the additional expenditure on them was met from Departmental savings. These savings had been effected chiefly by converting Shahi Schools at unimportant places into what were known as the New Type of Local Fund Schools. These were to be maintained at a reduced expenditure out of a contribution from Shahi funds until such time as the Local Boards were in a position to take them over. Since 1932 the funds at the disposal of the Department have not been such as to enable it to push its schemes for the expansion of Primary Education further. Nor has its hope that the Local Boards would take over the New Type of Local Fund Schools been realised.

Nevertheless, the fact that the number of Primary Schools increased from 921 in 1910-11 to 4,368 in 1934-55 and the number of pupils from 48,113 in the former year to 2,73,097 in the latter, shows that the progress of Primary Education during the period was satisfactory There was a corresponding increase in the expenditure on Primary Education, which in 1934-35 amounted to Rs. 25,88,941, as against Rs. 2,81,693 in 1910-11. This increase in expenditure would have resulted in greater expansion but for the reason that provision had to be made in one and the same school for imparting instruction through the various vernaculars in accordance with the orders of Government that Primary Education should be given through the mother-tongue of the pupils.

Industrial and Technical Education.

There were only half-a-dozen Industrial and Technical Schools in 1911. Three such schools were added in 1922-33, one of them being the Osmania Central Technical Institute, Hyderabad. There were in 1934-35, 11 Industrial and Technical (3 Government, 3 Local Fund and 5 Aided) Schools with a total strength of 1,286.

Girls' Education.

Girls' Education was at a low ebb in 1911. The first measure that was adopted to develop and organise it on a sound basis was that in 1913-14 an Inspectress of Girls' Schools was appointed in accordance with Mr. Mayhew's recommendations. This was followed by the opening of a large number of Girls' Schools between 1914-15 and 1921-22. For many years one great obstacle in the way of Girls' Education had been the dearth of qualified women teachers. In order to overcome this difficulty, four Training Schools for women were opened during the years 1918-19 and 1919-20 at Hyderabad, Warangal, Aurangabad and Gulburga. After 1922-23, owing to lack of funds, the Department had to put a check to its policy of expansion,

as in the case of Boy's schools and to devote its attention chiefly to strengthening and improving institutions already existing. The result was that whereas between 1915-16 and 1921-22 there was an increase of 669 Girls' Schools, the total number of schools added between 1922-23 and 1934-35 was only 35. It is, however, gratifying to note that during the six years between 1928-29 and 1934-35, Secondary Education for Girls made great headway, especially at Headquarters. Six Middle Schools and 3 High Schools were added during this period, while the Nampalli Zenana School, where Intermediate Classes had been opened in 1923-24, was raised to the status of a First Grade College in 1931-32 under the name of the Osmania University College for Women. During this period the Mahboobia Girls' High School has also an excellent record of progress to its credit. This institution has an imposing building and a highly qualified staff, which includes seven European ladies. It has continued to prepare its pupils for the Cambridge Local Examinations.

The following table shows the number of Girls' Schools in 1910-11 and 1934-35:—

Year.	Schools.	Scholars
1910-11	91	6,346
1934-35	704	49,763

Of the 704 schools, there were in 1934 35, 674 Primary Schools with 41, 213 pupils, 17 Middle Schools with 3,552 pupils, 8 High Schools with 2,867 pupils and one First Grade College with 555 in the School Section and 33 in the College Section. The remaining four schools were Special Schools.

Education of the Depressed Classes.

As experience had shown that, owing to their social disabilities, the depressed class children were often unable, as in other parts of India, to take full advantage of the Public Schools, in 1916-17 Government adopted the policy

of opening special schools for such children. At first these schools were chiefly of the Aided type, but in 1933-34, 18 schools under the Private Agency were taken over by the Education Department and converted into Shahi Schools. A year later Government were pleased to sanction a comprehensive scheme providing increased facilities for the education of the depressed class children, but, owing to lack of funds, it has not been found possible to put it into force yet. There were at the end of 1934-35, 101 Schools for the depressed class children with 3,514 pupils. The expenditure under this head amounted to Rs. 28,797.

Religious Schools.

The Ecclesiastical Department maintains 3 Islamic Schools, while 12 Islamic Schools and 6 Sanskrit and Vedic Schools are Aided institutions. In 1934-35 the total strength of the Religious Schools was 1,308, while the aggregate expenditure amounted to Rs. 46,860, including the grant-in-aid of Rs. 34,450 awarded to Madrasa-e-Nizamia, Hyderabad Deccan, founded in 1913-14.

Adult Education.

Three Adult Schools were started under the Private Agency for the first time in 1925-26 in the City of Hyderabad with the object of spreading literacy amongst adults. The movement extended to the Districts in 1930-31, and by 1934-35, 49 Adult Schools (19 in Balda and 30 in the Districts) had been established. Of these, 25 were Aided and 24 Unaided Recognised institutions. The total number of pupils under instruction in the Adult Schools in 1934-35 was 1,761.

In 1933-34 special rules and regulations laying down the lines on which Adult Schools should be organised and conducted were enforced. It is to be regretted that so far the public has not shown that interest in this movement which it deserves and which is so necessary for its rapid growth.

Physical Education.

In 1911 there were Gymnastic Instructors in all the High Schools and some of the more important Middle Schools. These instructors were usually retired soldiers of the army with hardly any idea of the kind of physical exercises needed for school boys. The first step which was taken to place Physical Education on a sound basis was to secure in 1914-15 from the Y. M. C. A., Hyderabad, on payment of an annual grant of Rs. 2,500, the services of their Physical Director to train drill-masters, supervise Physical Education in schools and generally to advise the Education Department on all questions affecting Physical Education. The next step taken was the founding of the Hyderabad Athletic Association in 1919-20 with the object of encouraging sportsmanship through out-door games amongst the school boys at Headquarters. By 1920-21 all Government Middle Schools had been provided with Drill-Masters. In the same year the scale of salaries, which was originally Rs. 10 and later Rs. 15-20, was raised to Rs. 30-40 in the case of Senior Drill-Masters and Rs. 25-35 in the case of Junior Drill-Masters. Thereafter it became possible to attract a better type of men for service as Drill-Masters. The next important stage of development was that in 1925-26 the offices of Director of Boy Scouts and Chief Inspector of Physical Education were combined, Mr. S. M. Hadi, B A., (Cantab), being appointed to the new post. The arrangement made with the Y. M C. A. in 1914-15 thus came to an end after this. In order to emphasise the importance of Physical Education, orders were issued in 1928-29 making it compulsory for all school pupils to take some physical exercise every day. The Department then took up the question of improving further the quality of physical education. With this end in view, a College of Physical Education was opened in 1930-31, and Mr. F. Weber, B. P. E., who had already been appointed in the previous year as the Director of Physical Education for Colleges, was given charge of this College as well. The provision thus made for

giving graduate and undergraduate teachers training in Physical Education has greatly helped to raise the standard of Physical Education in the Secondary Schools to which they have returned after training. At the same time efforts have been made to improve the efficiency of the Drill-Masters by organising short courses of training for them.

The Boy Scout and Girl Guide Movements.

The Boy Scout movement was formally inaugurated in H.'E. H the Nizam's Dominions in 1923-24. The Director of Physical Education for Schools is also the Organising Commissioner of Boy Scouts. To enlist the co-operation of the public in the Boy Scout movement, 7 Local Associations—2 at Headquarters and 5 in the Districts—have recently been started. In 1934-35 there were altogether 110 troops with a strength of 3247. The troops in the Administered Areas are under a separate organisation.

The Girl Guide Movement in the State is of more recent origin, the date of its inception being 1928-29. For the furtherance and improvement of the movement, Government appointed a Guide Trainer in 1929-30. Since then it has made rapid strides. In 1934-35 the Guides, Blue-birds and Rangers numbered 1942.

Training of Teachers.

There was only one training institution in 1911, viz., the Government Normal School at Hyderabad, where teachers drawn from the Primary Schools were trained for a period of two years. Owing to the expansion of Primary and Secondary Education, the need for providing more adequate facilities for the training of teachers became imperative. Therefore in 1918-19, 4 new Training Schools were opened-three for women, at Hyderabad, Warangal and Aurangabad and one for men at Warangal. A year later a Training School was established at Gulburga for women teachers and another for male teachers at Aurangabad. The Training Schools at Warangal, Aurangabad and Gulburga

were intended to train teachers for work in the different Divisions in the Vernacular of the Division, while the Training School at Hyderabad was started for teachers of Urdu Girls' Primary Schools.

The training of teachers of Secondary Schools was first undertaken in 1924 when arrangements were made in the Training School for Men at Hyderabad for training every year 25 Matriculates along with 100 Middle passed teachers. Two years later a class for the training of Intermediates, with one year's course, was opened, and at the same time, by cutting down the subjects of general education, the period of training for Middle passed men and Matriculates was reduced from two years and 1½ years, respectively, to one year. With the creation of the Faculty of Education in the Osmania University, a class for the training of Graduates was added in 1929 and to mark the change in its status, the institution was called the Osmania Training College.

The class for the training of Middle passed Urdu teachers in the Training College was abolished in 1931 and arrangements were made for training such teachers along with Marathi teachers in the Aurangabad Training School, Telugu teachers in the Warangal Training School and Canarese teachers in the Gulburga Training School. The Training Schools at Aurangabad and Warangal were further developed in 1934, when a class for the training of Matriculates was added in each of these institutions.

Including two Recognised Normal Schools maintained by the Wesleyan Mission, one for men at Medak and the other for women at Secunderabad, there were in 1934-35, 9 Training Institutions of all grades with an aggregate strength of 281.

The Inspectorate.

A Chief Inspector of High Schools was appointed in 1912-13 and a Chief Inspectress of Girls' Schools in 1913-14. A scheme for giving each district an Inspector of Schools,

based on Mr. Mayhew's recommendations,was sanctioned in 1913-14; but it was not till 1917-18 that the scheme was completely put into force. The scheme also provided for the appointment of an additional Nazir or Sub-Assistant Inspector in each district for every increase of 66 Primary Schools.

A complete reorganisation of the Inspectorate was effected in 1917-18. With a view to decentralisation of administration, each Suba was given a Divisional Inspector and the grade of the Inspector at Head-Quarters was also raised to that of a Divisional Inspector. Besides co-ordinating the work of the District Inspectors under him, each Divisional Inspector was required to devote his full attention to the organisation and development of Secondary Education in his Division.

Owing to the creation of Divisional Inspectorships, the office of Chief Inspector of High Schools had become unnecessary. Therefore, this post was abolished in 1920 and that of Deputy-Director of Public Instruction was created.

Conclusion.

The first twenty-five years of the reign of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur may well be called an Era of Enlightenment and Progress. His Exalted Highness resolved at the very outset to make Hyderabad a modern state. With this end in view, he devoted special attention to the development and spread of education in the State, and his deep interest in education resulted, within six years of his accession, in the creation of the Osmania University, which is a landmark in the history of education in the State. This re-orientation of educational policy has accelerated the rate of progress and brought about a wider diffusion of knowledge and culture than would have been possible under a system of education through the medium of a foreign language. Thanks to His Exalted Highness' munificence and to the financial prosperity of the

State, the educational budget steadily rose from Rs. 14 lakhs in 1910-11 to well over a crore in 1934-35. The increase in the number of institutions and scholars during the period was as follows:—

Year	Institutions	Scholars
1910-11	1036	66,482
1934-35	4746	3,53,582

It will be seen from the above table that the number of institutions and scholars has increased about five times since 1911. The proportion of pupils under instruction to the total population of school-going age was less than 5 per cent in that year; now it is nearly 18 per cent. The proportion of boys to the male population of school-going age is now nearly 30 per cent, as against 5.9 per cent in 1911, while that of girls to the female population of school-going age is now nearly 5 per cent, as against 0.7 in 1911.

It is interesting to observe that just as a report on the reorganisation of education in the State marked the beginning of the Silver Jubilee period, so also another report dealing with educational reconstruction in the light of more recent developments marks the conclusion of that period and the opening of a new chapter in the history of education in the State. The idea of remodelling the system of education with a view to the introduction of vocational training, which is now engaging the serious attention of educationists in British India, has been under the consideration of His Exalted Highness' Government for many years past. As far back as in 1925 a Committee was appointed to consider this question, and in the same year, in his able and inspiring Convocation Address of the Punjab University, the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari not only urged the need for reorganising the system of education, but suggested the lines on which reform should be carried out. The main principles enunciated by Sir Akbar Hydari were endorsed by the Punjab Inquiry Committee and later by the All-India Universities Conference, held in March, 1934. These

principles are: (1) that Primary education should aim not merely at making the masses literate but at providing a better equipment for their lives; (2) that each stage of education should be self-contained with a definite objective of its own; and (3) that there should be a large diversion in the pre-university stage from a purely literary course either to occupations or vocational institutions.

As a result of the recommendations of the Committee appointed in 1925, vocational instruction was introduced in a number of schools between 1928 and 1933, side by side with the already existing courses of general education. In November, 1934, in his presidential address at the 8th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, the late Dr. A. H. Mackenzie, the then Pro-Vice-Chancellor of the Osmania University, drew attention to the need for a radical change in the educational system of the State. The scheme which he outlined in his address was similar to that proposed by the Government of the United Provinces and embodied, in the main, the principles laid down by the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari in his Punjab University Convocation Address. The Government of His Exalted Highness the Nizam at once appointed a Committee to consider the question of educational re-organisation. Two members of the Committee, viz., Mr. Fazl Muhammad Khan and the late Dr. Mackenzie, were constituted into a Sub-Committee, and the recommendations made by them were sanctioned by Government with certain modifications in October, 1936.

The leading features of the new scheme are as follows:—

(1) There should be four stages of instruction each with a definite objective: Primary (5 years), Secondary (4 years), High (3 years) and University (3 years).

(2) The Secondary Stage should not only provide vocational instruction, but should constitute a suitable

foundation for higher studies. In the High Stage there should be, besides courses in Arts and Science, Technical courses in Agriculture, Commerce and Industries.

(3) There should be no departure from the existing policy of the State regarding the medium of instruction.

(4) A Board of Education should be established for the supervision and control of Secondary and High School Education with the Director of Public Instruction as *ex-officio* Chairman. It should include representatives of the Education Department, the Osmania University, of the public and Girls' Education as well as representatives of the Agriculture, Commerce and Industries, Co-operative and Public Works Departments.

(5) There should be two examinations, one at the end of the Secondary Stage and the other at the end of the High School Stage.

The main defect of the existing system of education is the uniformity of the High school course, which is dominated by the requirements of University education. Under the scheme recently sanctioned by His Exalted Highness' Government, the curriculum will be rendered more elastic with different courses of study for pupils with an academic bent and for those who wish to pursue higher professional studies or to enter on a practical career after the completion of the High School course. At the same time, the courses of study in the Primary and Secondary Schools in the rural areas will be brought more into harmony with rural conditions. The scheme will also definitely raise the standard of admission to the University for which there is great need.

One of the objects of the Reorganisation Scheme is to correlate education to employment. In order that this object may be attained, it will be necessary for the Departments of Agriculture and Commerce and Industries actively to co-operate by creating new openings for the employment

of young men who will take the agricultural, commercial and industrial courses under the new scheme.

As regards of the Nizam College, one of the reservations made by Government while sanctioning the Report of the Sub-Committee for the Reorganisation of Education is "that the affiliation of the Nizam College with the Madras University be continued for the time being." The words "for the time being" suggest that Government intend to reconsider the recommendation of the Sub-Committee that "the Nizam College should be an Associated College of the Osmania University, working for the degrees granted by the Osmania University, but with English as the medium of instruction...................". On page 2 para 4-c of their report, the Sub-Commitee give their reasons for making this recommendation. "Our witnesses were practically unanimous", they write, "that the control which the Madras University now exercises over education in H. E. H. the Nizam's Dominions should cease. We personally are strongly of the same opinion. The educational system and courses of study of every State should be devised with special reference to the needs and conditions of its own people. It is from an educational point of view highly unsatisfactory that a body situated 500 miles away from the capital of the Dominions should exercise any control whatever over the educational system of the State. It is obvious that the Government of the Dominions cannot express through their own educational system their own views regarding the lines of development in the State so long as any part of this system is outside their control."

Much preliminary spade-work will be necessary before the Reorganisation Scheme is actually put into force, and even after the completion of this work, it is proposed to introduce vocational and technical courses gradually as funds become available and as the economic conditions of the state demand. When the scheme materialises, Hyderbad will have the proud satisfaction of having given the lead

to the rest of India in reorganising education to meet the present-day needs just as it has already given the lead in the matter of imparting higher education through the medium of the Vernacular.

We are fortunate in having as our Educational member Nawab Mahdi Yar Jung Bahdur who has had actual experience of educational organisation and administration both in British India and the State and who has made a careful study of the educational needs of the State. Apart from Educational Reorganisation, the questions which are now engaging his earnest attention are those of Primary Education and Women's Education. In a speech which he recently made at the Tenth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, he declared that it was the intention of Government to adopt effective measures for the expansion of Primary Education. He sympathised with the proposal for the introduction of compulsory education, but pointed out that owing to practical and administrative difficulties, it was not possible to make Primary Education compulsory all at once. "There are facilities yet to be provided," he said, "for those who now willingly go to school." The Report of the Sub-Committee for the Reorganisation of Education also states that the "object of the Education Department is to expand Primary Education to such an extent as to bring it within the reach of every boy and girl of school-going age." Still more significant is the reference to Primary Education made by our farsighted and benevolent Ruler in his reply to the address which was presented by his loyal subjects on the occasion of the Silver Jubilee. "It is my special desire," said His Exallted Highness, "that elementary education should become universal; that there should be more primary schools and that they should all have suitable buildings provided for them; and that through Local Fund Committees, opportunities should be given to the public to interest themselves in, and to further the cause of elementary education." In view of this

pronouncement, we may safely anticipate that in the near feature steps will be taken to draw up a regular programme for further expansion and improvement of Primary Education, so that it may be financed as funds are available.

Equally, if not more, pressing, is the problem of Women's Education. The constitution of the Board of Education provides not only for the representation of women but also for the establishment of a statutory Committee for Girls' Education. When this Committee, which will be composed mainly of women, is formed, it will no doubt give an impetus to Women's Education. The deep interest which Her Royal Highness the Princess of Berar takes in all movements connected with the uplift of women is also a happy augury for the future of Girls' Education in the State.

This article will be incomplete without a mention of the Teachers' Associations which have been established in the various Divisions during the last decade. The Hyderabad Teachers' Association, in particular, has done yeomen service in stimulating the interest of teachers in the technique of education. The different Committees appointed by the Association in the past few years have produced more than a dozen useful reports on the teaching of various school subjects and other educational matters, while *The Hyderabad Teacher*, the quarterly organ of the Association, has helped to keep the teachers in touch with the latest developments in educational theory and practice and to focus their attention on the current educational problems.

With His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari as President of the Council and Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur as Education Member, both in the front-rank of educationists in India, and with an enlightened Ruler ever ready to give his gracious support and patronage to all schemes for the educational advancement of his subjects, a bright future for education in these Dominions may confidently be predicted.

May His Exalted Highness live long in health and happiness so that this great State may continue to reap the benefits of his benign rule!

Dominion Scout Rally

BY

Syed Mohammed Hadi, M. A. (Cantab),

Organising Commissioner of Boy Scouts and Director of Physical Education for Schools.

The Boy Scout Movement is connected with the various measures of reform adopted from time to time to promote the welfare of the youth of the Hyderabad State. It was in the fitness of things that a Scout function should have been arranged on the great and auspicious occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, G. C. S. I., G. B. E, Nizam of Hyderabad and Berar. The grandeur of this Rally and the arrangements made in connection with it were such that it might have been more aptly called a 'Jamboree'.

Preparations were afoot weeks before the actual date of the Rally and not less than two hundred and twenty five tents were pitched on the Beresford Polo Ground for the troops. Special arrangements for the supply of pipe-water and electricity in the Camp were made and kitchen sheds were erected for those troops which desired to do their own cooking. There were four hotels, vegetarian and non-vegetarian, which were given a contract to supply food at a reasonable rate to those troops which did not wish to do their own cooking. An arch was constructed with staves and decorated with the scarves of the troops present in the Camp.

The work of the camp was distributed among various scout officers who had volunteered their services. The Rovers were of great service to the Head-Quarters. Each section of the Camp was under the charge of a section

officer. Three of the District Commissioners—Nawab Nazir Yar Jung Bahadur, Mr. S. Ali Akbar and Mr. Shaik Abul Hassan—showed their interest in the Scout Movement by acting as section officers and their very presence in the Camp was a source of great encouragement to the organisers.

From the 21st February troops began to pour into the Camp and the Registration Officers had a busy time. By the 22nd morning no less than 1681 Scouters, Rovers, Scouts and Cubs had gathered in the Camp, including representatives from Mysore, Baroda and Secunderabad. When the Hon'ble the Education Member arrived at 11 A. M. to open the Camp, it presented a wonderful sight. The flag was hoisted with due ceremony. The Camp Chief thanked Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur for accepting his invitation to perform the opening ceremony of the Camp. In his welcome speech, the Hon'ble the Education Member congratulated the organisers on their effort and advised the Campers to make the best use of the opportunity given to them. He hoped that they would all enjoy their stay in the camp and make friends with the visitors from the sister Indian States.

The Camp programme, which had been carefully drawn up, included competitions, lectures, conferences, displays, Camp-fires and a procession through the City. We are very much indebted to Messrs. S. Ali Akbar and Akbar Ali Khan who addressed the Campers on 'Discipline' and 'Citizenship', respectively. Both the addresses were very instructive and interesting. The Conferences too were very successful, thanks to the tact and ability of the Presidents, Mr. S. M. Azam, Nawab Nazir Yar Jung Bahadur and Mr. S. Ali Akbar, who made very illuminating and useful speeches and conducted the proceedings of the Conferences most ably.

The Camp-fires were very interesting. They brought to light the latent talents of our scouts and were greatly appreciated by the boys as well as by the large number of guests who were present.

On the third day of the Camp a procession of the Campers started at 9-30 A. M. and marched through the main streets of the Capital. It was a grand sight. The boys kept playing their bands and singing their marching songs all along the route. A halt was made at the River Gardens for rest and refreshments. After one hour the procession started on its return journey reaching the Camp at about 1 P. M.

There was a rehearsal of the March-Past and Displays the same evening in the presence of Mr. Fazl Mohammed Khan, the Director of Public Instruction. At the conclusion of the displays, he addressed the Campers and expressed his satisfaction at their performance and the arrangements made at the Camp. While he was making the speech, Nawab Sultan Yar Jung Bahadur brought the happy tidings that His Exalted Highness would honour us with his gracious presence at the Grand Rally the next morning. This piece of news was received with great joy by every one present and soon the organisers busied themselves in making preparations to give a royal reception to H. E. H., especially as he was visiting a Scout function for the first time.

Those gentlemen who were appointed judges of the Scout Exhibition busied themselves in selecting the best exhibits and it was not before 1 A. M. that they completed their work. The number of articles was large and most of the exhibits were so well prepared that the judges found it no easy task to award the prizes. These articles had been neatly arranged in a large *shamiana.*

By 8 A. M. on the 24th February all the campers were waiting to receive the Royal guest in a fitting manner. The large *shamianas* were beautifully decorated. The furniture and refreshments were supplied by the Amira Department. H. H. the Prince of Berar, Walashan General Prince Moazzum Jah Bahadur, His Excellency the Maharaja Bahadur and Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur arrived at

the Camp just before 9 A. M. and His Exalted Highness came a little later. The Guard-of-Honour supplied by the Jagirdar College Troops gave the Royal Salute and the Hon'ble the Education Member received the Royal Guest. A short programme consisting of Flag Hoisting Ceremony, March-Past and special and simultaneous displays followed and His Exalted Highness evinced deep interest in the displays. After a stay of about twenty minutes the Royal guest went to the Exhibition Tent, where also he expressed his appreciation of the work done by the Scouts. He then left the Camp, leaving behind, however, the other members of the Royal House to watch the programme to its end. The Princes stayed for half an hour more, at the end of which the function came to a very successful close with the singing of the National Anthem. Two days later His Exalted Highness was graciously pleased to send the following message to the Scouts through Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur:-

"The Scouts may be informed that I was very pleased with the displays etc given by them".

The presence of the Ruler at the Rally was a very great honour to the Scouts which was greatly appreciated by them. It has given a stimulus to the movement in the Dominions.

At 10 A. M. on the following day, i. e. 25th February, the Hon'ble the Education Member visited the Camp again. He inspected every troop at its Camp-site and after the flag hoisting Ceremony, distributed the prizes to the winners of the various competitions, etc. It is difficult to find words to express our gratitude adequately to Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur for the deep interest he showed in the Dominion Rally and the encouragement and support which he has always given to the movement.

After the departure of the Hon'ble the Education Member, the Camp Chief made a speech in which he thanked his co-workers for the valuable help they had given him in making the Rally so great a success. He thanked

all the Campers for the excellent spirit and discipline shown during the Camp days. He also expressed his gratitude to all the Commissioners, Assistant Commissioners, and the Camp Doctor, Mr. Abid Hussain, for their help and co-operation. Suitable replies were made, congratulating the Camp Chief on the success of the Camp and thanking him for all he had done for the convenience of the Campers.

The Camp broke up at 11-30 A. M.

In conclusion, it must be remarked that the success achieved exceeded the expectations of the organisers. There was a brotherly atmosphere throughout the camp period and the boys besides enjoying their stay in the Camp, evinced a keen sense of duty and a spirit of service. Such rallies are a powerful and necessary agency not merely in increasing the efficiency and usefulness of the scouts but also in bringing about a proper understanding between the scouts of the districts and those of Balda and between scouts of different communities, an understanding which at the present day we are in dire need of.

The Silver Jubilee Education Exhibition.

On the occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam, an educational exhibition was held at the Public Gardens along with the displays organised by the other departments. About 3,250 exhibits were received from 209 different schools, but owing to lack of space, the Committee were compelled to make a selection, with the result that nearly 1,000 articles could not be exhibited. Friday, 26th February, 1937, was a proud day for the Education Department, for on that day our beloved Ruler was not only graciously pleased to open the Exhibition but to express his appreciation of the quality and variety of the exhibits as well as the manner in which they had been arranged.

The exhibition was divided into seven Sections, viz., Art Section, Arts & Crafts Section, Kindergarten Section, Maps, Charts & Models, Domestic Science Section, Calligraphy and Teachers' Section.

The number of schools in the different Divisions which took part in the Exhibition was as follows:—

Division.	No. of Exhibits.
Balda (Including the City College and the Jagirdars' College and the Girls' Schools).	45
Secunderabad	6
Depressed Class Schools	18
Medak Division	26
Gulburga Division....	17
Aurangabad "	44
Warangal "	53
Total	209

The judges were of the opinion that the exhibits under all the Sections except three, viz., Maps and Charts, Calligraphy and under the Domestic Science Section Plain Sewing, were of a high order. The articles made by the teachers and pupils of the Depressed Class Schools were greatly appreciated.

The Committee which had been appointed to organise the Exhibition consisted of Mr. Fazl Mohamad Khan (President), Miss. G. M. Linnell, Dr. A. Pope, Miss. D. Webster, Mr. Sajjad Mirza, Mr. Ahmed Husain Khan, Mrs. Jamaluddin, Miss. D. Nundy, Mr. R. S. Hughesdon, Mr. Bellingham, Miss. Cowan, Mr. Culver, Mrs. Chick, Mr. Nazir Husain Sharif, Mr. Sher Mohamed Khan, Mr. S. M. H. Nakavi, Miss. K. Linnell, Mr. Gulam Rabbani, Mr. Mir Ahmad Ali Khan and Mr. Syed Ali Akbar (Secretary).

The Exhibition lasted till the 14th March, 1937. The prize distribution took place at the Mahboobia Girls' High School on 6th March, 1937. After giving away the prizes, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, the Hon'ble Member for Education, congratulated the organisers on the success of the Exhibition. The teachers who had helped the Exhibition Committee in receiving and arranging the exhibits and in other ways were awarded a certificate each, printed artistically with the picture of the Jubilee Hall at the top.

The following is the text of the speech which Mr. Fazl Mohamad Khan, Director of Public Instruction, made on the 14th March, 1937, before requesting the Hon'ble the Education Member to distribute the prizes and the certificates :—

"Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, Ladies and Gentlemen,

On behalf of the Education Department, I welcome you all with great pleasure and thank you for the trouble you have so kindly taken to attend this function. I particularly thank you, Sir, for giving us so much of your

valuable time in spite of your multifarious and onerous duties. The keen interest you are taking in our work is a great incentive for the Department to make further progress. We are very grateful to you for your generous support to the Educational Exhibition, which the Department has arranged in honour of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam's glorious reign.

"The Education Department is deeply indebted to the Silver Jubilee Departmental Progress Committee. They assigned to us the Town Hall for the Educational Exhibition and gave us generous help and support throughout. We are thankful to all the members of the Committee, particularly Nawab Zain Yar Jung Bahadur, Mr. Syed Ali Raza, Nawab Rahmat Yar Jung Bahadur, Mr. Meher Ali Fazil, Mr. Jamal-ud-Din, Mr. Armstead and to Mr. Syed Mohamed Mehdi, the indefatigable Secretary of the Committee, whose helpful co-operation was a source of strength to the Educational Exhibition Committee

"The judging of the exhibits was a difficult and laborious task. Our warmest thanks are due to the Committee of Judges, which consisted of:

Mrs. Engler, Mrs. Norman Walker, Mr. Syed Mohamed Husain Jafari, Mr. Syed Aziz Ali, Mr. and Mrs. Harold Green, Miss Muirhead, Mr. Ghulam Yazdani, Mr. Qazi Mohamed Husain, Mr. W. Turner, Miss. Pym and Mr. Ahmed Husain Khan.

"The number of prizes awarded is as follows:—

First Class Prizes	...	92
Second Class Prizes	...	52
Third Class Prizes	...	26
Special Prizes ...	...	20

Of the 171 prize-winners, 55 are teachers and 116 pupils.

"The success of the Exhibition is mainly due to the unremitting labours of the members of the Educational Exhibition Committee and to the willing co-operation which they received from a large number of teachers. The credit for the decorations in the Town Hall is due to the ladies on

the Exhibition Committee. We are particularly grateful to Miss G. M. Linnell for the enormous pains which she took not only in preparing the decorations but in fixing them artistically. The ladies and gentlemen, who arranged the exhibits in the various sections, had to work very hard for many days. They deserve our best thanks for the tasteful manner in which they arranged the exhibits. I am sure you wish to hear their names. They are Miss Pope, Miss Webster, Miss K. Linnell, Mrs. Jamal-ud-din, Mr. Sajjad Mirza, Miss Cowan, Miss Thompson, Mr. Hughesdon, Miss Henry, Mrs. Timmins, Mr. Ahmed Hussain Khan, Mr. Bellingham, Mr. Culver, Mrs. Chick and Mr. Samiullah. They were assisted by many teachers from Head-quarters and some from the Districts, whose names will be announced when the Prize Distribution begins. We are thankful to them all.

"The Education Department has also taken upon its shoulders the responsibility for arranging to show the Educational Exhibition to the Public every day. From 3 p. m. to 10 p. m. about 65 teachers from various Government schools are placed on duty every day in the Town Hall under a gazetted officer of the Department. It is estimated that, on an average, about 15,000 people have been visiting the Exhibition daily since its opening. Messrs. Khairat Ali, Nakavi, Ghulam Qadir, Mir Ahmed Ali Khan, Mahmood Ali Baig, Abdul Aziz and Salim-bin Sayeed, with the help of Boy Scouts, have done commendable work in controlling the crowds and ensuring the safe custody of the exhibits.

"Another officer whose work deserves appreciation, is Mr. Nazir Husain Sharif. He has been indefatigable in maintaining a record of all the exhibits and in keeping them in safe custody at all times.

"Messrs. Khairat Ali, Nakavi, Mahomed Raza, Abdullah and Imtiaz Ali Khan have given the Secretary valuable assistance in making arrangements for the Prize-Distri-

bution. Mr. Khairat Ali has, in addition, helped the Secretary in every branch of work connected with the Exhibition.

"We are also thankful to Miss Urwick and the Girl Guides, and Mr. Hadi and the Boy Scouts for their help. We thank Miss Linnell for the use of this Hall and for her help in making arrangements for this function.

"Finally, the warmest and the sincerest thanks of the Department are due to Mr. Syed Ali Akbar, the energetic Secretary of the Educational Exhibition Committee, on whose shoulders fell the double responsibility of writing the history of Education, on the one hand, and of supervising the Exhibition arrangements in the Town Hall, on the other. The shortness of the time at our disposal made his work extremely difficult. I am sure I am voicing the feelings of the whole Department when I say that we are all most grateful to him for the admirable manner in which he completed his doubly difficult task.

I now request you, Sir, to give away the prizes and I ask the Secretary to announce the prize winners."

The Hyderabad Teachers' Association: A Retrospect.

BY

G. A. Chandawarkar, M. A.,
Head Master, Govt. Middle School, Sultan Bazars.

Of the many healthy educational activities that have been encouraged and developed during the beneficent rule of His Exalted Highness the Nizam, Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, the starting of Teachers' Associations in the different parts of the Dominions is one. The work done by the Education Department in spreading education and improving the quality of instruction has been supplemented by these Associations, inasmuch as they have provided an opportunity to teachers of keeping themselves in touch with new developments in the field of pedagogics. The Teachers' Association at Headquarters known as "The Hyderabad Teachers' Association" has, in particular, done much useful work in this direction during the last 12 years.

The Origin and Aims and Objects of the Association.—In the year 1923, soon after Mr. Syed Ali Akbar, M. A., (Cantab), took charge of the office of Divisional Inspector of Schools, Headquarters, he conceived the happy idea of starting an association for the benefit of the teachers employed in the schools under his jurisdiction. A Committee was appointed and the rules and regulations drawn up by it were approved by Government in 1924-25. The Association came into existence in June 1925 with the following aims and objects :—

(1) To increase the knowledge of the theory and practice of education, possessed by teachers in Government and Aided Schools.

(2) To create an *espirit de corps* amongst the teachers of various schools by providing them with opportunities of meeting together.

(3) To promote co-operation among different schools.

(4) To consider and discuss proposals for remedying the defects in the present educational system, subject to the rules of the Association and in accordance with the procedure laid down by it.

(5) To promote the physical, mental and moral welfare of the students.

The means for the attainment of these objects were to be as follows:—

(1) Arranging every month lectures, discussions and model lessons.

(2) Organising annually an Educational Conference and an Educational Exhibition.

(3) Arranging for special lectures by distinguished persons on educational subjects.

(4) Publishing a Quarterly Magazine.

From the following brief account it will be clear that sincere endeavours have been made during the past twelve years to realise the object with which the Association was started.

Its Constitution.—The Association had in the beginning 15 branches with over a thousand members. But in 1933 when the branches at Secunderabad and Bolarum formed themselves into a separate association, there remained only 12 branches. In 1936 there were 13 branches with 810 members.

The Director of Public Instruction is the patron of the Association, the Divisional Inspector of Schools, Balda, its President, the Senior Nazir its General Secretary and the Assistant Divisional Inspector its Treasurer. The Central

Executive Committee exercises a general control over all affairs, makes arrangements for the monthly meetings to be held at different centres and for the annual conference and the exhibition.

Membership of the Association is obligatory on all teachers employed in schools within the jurisdiction of the Divisional Inspector of Schools. The subscription which each member has to pay depends upon his scale of salary and ranges from one anna to one rupee a month.

Its Work and Achievements.—In addition to preparing a programme of work for the monthly meetings at the different centres and organising a Conference every year, the Central Executive Committee has been regularly appointing since 1927 sub-committees to draw up reports on special subjects. Till now 16 reports on important subjects have been prepared and published, viz., The Teaching of English, History, Geography, Mathematics, Science, Urdu, and Moral Instruction, Vocational Education, Physical Education, the Teaching of Drawing and Classical Languages, Kindergartens, the Problem of Backward Children, Examinations and Extra-curricular Activities. The latest report is on "School Discipline" Each report has been the result of patient and diligent work on the part of the members of the Sub-Committee appointed to draw it up.

The Annual Conferences.—Of the activities of the Hyderabad Teachers' Association, perhaps the most valuable is the Annual Conference, which is attended not only by the members of the Association but by the educational officers and teachers in the districts, the members of the Secunderabad Teachers' Association and by the general public. The Conferences held so far have been presided over by a succession of eminent men, viz., The Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Mr. Fazl Muhammad Khan, Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, Nawab Nizamat Jung Bahadur, Nawab Zulkadar Jung Bahadur, Dr. A. H.

Mackenzie and Mr. Qazi Mohamed Husain. The presidential addresses delivered at these Conferences have all been of great value to those interested in education, especially teachers, as they have dealt at length with the special problems of education in the State. In this connection, particular mention may be made of the presidential address delivered by Dr. A. H. Mackenzie in 1934. It contained certain suggestions for the reorganisation of Secondary Education in the State which, in the main, have been incorporated in the scheme recently sanctioned by Government.

Another important and noteworthy feature of these conferences is that during the sessions specialists give a series of 'Demonstration Lessons', which serve the purpose of 'Refresher Courses' for teachers. Besides all this, lectures by eminent men on educational subjects, scout displays, musical concerts, *Mushairas* and other social and educational activities are also organised.

It will thus be seen that apart from their educational importance these annual gatherings have a great social value.

The Educational Exhibitions—At each Conference an educational exhibition is also held. There has been a steady improvement both in the quantity and the quality of the exhibits. At the Nagpur All-India Exhibition of 1935, organised by the All-India Federation of Teachers' Association, as many as 14 prizes were won by our schools.

The Garden Competition.—For the first time in 1933 a garden competition was held in connection with the Annual Conference of the year and since then it has been held regularly every year. There is a rolling cup which has been won by the Government Nampalli High School for two years in succession, in 1935 & 1936.

Special Lectures.—Among the distinguished educationists who have delivered lectures under the auspices of the

Hyderabad Teachers' Association may be mentioned Dr. Rabindranath Tagore, Dr. Tracy Strong, Professor Wadia, Professor J. L. Horundka and Dr. Harold Mann.

The Library.—When in October 1927, Messrs Syed Ali Akbar and Syed Mohamed Husain Jaffery retuned from England after attending the Imperial Educational Conference, the Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association raised a sum of Rs. 600 to give them an 'At Home', but these two gentlemen expressed the wish that the amount should be utilised for establishing a library. Accordingly, a library was opened in 1928. In 1931 the Education Department sanctioned a lump sum of Rs. 1,000 and a monthly grant of Rs. 15 for the library. In 1935 Nawab Rustum Yar Jung Bahadur kindly presented a complete set of Encyclopaedia Brittanica to the Library. A year later Mr. Syed Mohomed Husain Jaffery, B.A (Oxon), made a munificent gift of nearly 100 volumes on various useful subjects, in grateful recognition of which he was made an Honorary Life Member of the Association. Messrs. Weber and Ali Akbar have also presented a few books to the library. There are at present 644 English and 260 Urdu books in the Library.

The Hyderabad Teacher.—The Association has been managing an Anglo-Urdu Quarterly called *The Hyderabad Teacher* since 1925

Other Activities of the Association.—This Association was affiliated to the All-India Federation of Teachers' Association in November, 1928, and since then delegates have been attending its annual conferences and taking active part in them.

A Co-operative Credit Society was opened in 1929 for the benefit of the members.

A Bureau of Extra-curricular activities was established in 1935-36. It is an advisory board for all schools and an

agency for enlightening the public on Extra-curricular Activities such as scouting, Debating Societies and School Excursions.

The contribution which the Association has made to the recreative side is equally commendable. As a result of a suggestion made by Mr. Syed Ali Akbar in his lecture on "The Teacher and his Leisure" delivered at the Annual Conference in 1935, a Teachers' Club was opened in 1936. It has a Reading Room attached to it and a radio set has also been provided. There is provision for indoor games such as chess and ping-pong. During the last Education Week the Club organised tournaments in various games and also held its first annual dinner.

Conclusion.—From the brief account given above it will be seen that the Hyderabad Teachers' Association has undertaken many useful educational activities and has been endeavouring to serve the cause of education in the State. The Association owes much to Nawab Masood Jung Bahadur, its first patron, and to Mr. Fazl Muhammad Khan, the present Director of Public Instruction, for their patronage and valuable help, and also to Mr. Syed Ali Akbar, who is not only the founder and President of the Association but its very soul.

The great interest which His Exalted Highness the Nizam takes in all the educational activities of the State is well-known. During the Jubilee week he very graciously opened the Departmental Display, of which the Educational Exhibition formed a part. May the Almighty shower His choicest blessings on our Royal Master under whose enlightened rule the Hyderabad Teachers' Association, along with others of the same kind, has been able to carry on its useful activities!

Editorial Notes.

The Silver Jubilee of His Exalted Highness.

During the enlightened rule of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, G. C. S. I., G. B. E., Sultan-ul-Uloom, changes of far-reaching importance have taken place in all spheres of administrative activity. That these changes have contributed towards the prosperity of the State and the happiness of its people is an admitted fact. On ascending the *musnad* in 1911, His Exalted Highness had declared, "In every way I will do my best to do good to my people and my country." In his reply to the several addresses presented to him on the great and auspicious occasion of the Silver Jubilee, His Exalted Highness reiterated the high conception he has of his duty as a ruler. He said that *to be the servant of his beloved subjects was a source of pride and distinction to him.*

The nation-building departments have been especially dear to His Exalted Highness' heart, but no department has received his gracious patronage more than the Education Department. The importance which His Exalted Highness attaches to education is evident from the following passage in his speech:

"*Education is the soul of every country; without it a country is a body without life*".

The progress which has been achieved in the field of education during the last 25 years has not only been immense but unique in certain respects. The Education Department brought out a publication during the Jubilee celebrations which gives a connected and authoritative account of the development of the Department from the very beginning, with special reference to the progress which education has made under Asaf Jah VII, the present

ruler. Elsewhere in this issue appears an article based on the above-mentioned publication.

On the occasion of the Silver Jubilee, the Education Department also organised an Educational Exhibition which was kept open for the public for more than a fortnight. A report of this exhibition is published elsewhere.

It is the devout and fervent prayer of all the loyal subjects of His Exalted Highness that the Silver Jubilee period which has just closed may mark but the beginning of a new era of greater progress and possibilities which, in the fulness of time, will usher in the Diamond Jubilee of their exalted and beloved ruler.

Our New Sadr-e-Azam.

We offer our hearty congratulations to His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, P. C., LL. D., on his elevation to the high office of President of the State Executive Council. The appointment of a statesman of his standing as Sadr-e-Azam is to be specially welcomed at a time when the State is considering the question of entering the All-India Federation and when many problems relating to internal reform are awaiting solution. We who are engaged in educational work consider ourselves fortunate in having a Sadr-e-Azam who is a great educationist. A perusal of the article on "Educational Progress under Asaf Jah VII", published elsewhere, will reveal what a valuable contribution Sir Akbar has made to the educational development in the State during the last 27 years. As Home Secretary he gave a vigorous lead to Primary and Secondary Education and it was due to his insight and initiative that the Osmania University was brought into being. Even after he became Finance Member he did much to further the cause of education in Hyderabad. In his presidential address at the First Annual Conference

of the Hyderabad Teachers' Association, he described the policy which he followed as Finance Member. "A financier" he said "has not to hoard up money taken from the people but to give it back to them in the form of the nation-building Departments which serve to increase the efficiency and the comfort of the people".

Sir Akbar Hydari has always stood against communalism. In the presidential address referred to above, he appealed to the teachers to make the schools centres of love, unity and co-operation. "I trust", he declared "that the educational policy of this State at least will discourage communal institutions and foundations and have its schools open to all classes where the teacher will particularly guard against the approach of this malignant canker and see that whilst the pupils in his charge look upon him as their father they all regard their fellow-pupils as their brethren in a real sense. I am perfectly certain that if a deliberate attempt is made to give every opportunity to pupils of the different communities to mingle together and develop their common nationalism, instead of being allowed to drift apart into separate contending centres, this problem, the gradual and insidious growth of which throughout the land is giving cause for grave anxiety, will cease to trouble us".

We are confident that under Sir Akbar Hydari's able guidance our State will make rapid progress in all directions.

Women's Education in the Hyderabad State.

Prior to the accession of His Exalted Highness, facilities for Women's Education in the Dominions were extremely limited. The forces of liberalism had not then set in and the attitude of the public towards Girls' Education was very conservative. The accession of His Exalted Highness marked the beginning of an era of progress. Since

then the education of girls has advanced rapidly, and the number of Girls' Schools and pupils has increased more than seven times. The founding of the Osmania University has given a fillip to higher education for women, especially since the Osmania University College for Women was founded. At a time when girls are coming to the fore in the matter of education, it is the signal good fortune for us to have in our midst Her Royal Highness the Princess of Berar. She has made the women of Hyderabad feel proud of her by declaring, "As Hyderabad is now my home, I identify myself with all your hopes and interests, your ambitions and aspirations, and the welfare of your children. Ever since I came here, I have waited for the time when you would consider me as one of yourselves and believe that I am always ready to co-operate with you in every way that will help to attain your happiness". These words bear eloquent testimony to the deep and abiding interest which Her Royal Highness has in all that concerns the social and educational welfare of the women of the State. The memorable address, published elsewhere, which Her Royal Highness graciously delivered at the Tenth Session of the Hyderabad State Women's Conference, shows that she has made a deep study of the problems affecting the women of Hyderabad in particular and of India in general. Every word of it rings with sincerity and points to the way in which the salvation of women lies. There could have been no better message for the women of Hyderabad than the one with which Her Highness concluded the address: "Let your deepest concern", said Her Highness, "be for the health of your minds and bodies. Let your persistent thought be for your goal in life which is the reason of your being. Have confidence in yourselves and in your capacity. Let there be a meaning to your existence so that it will be remembered with respect and reverence by your children and their children".

Reviews.

The Osmania Magazine: Silver Jubilee Number.

The March number under review is the Silver Jubilee number which the Osmanians have brought out on the felicitous occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam, Asaf Jah VII. The magazine is handsomely illustrated and well got up. It contains admirable articles both in English and Urdu, contributed mostly by the students. In the English section the article "Challenge to Students" is a bold and frank study of the problems which confront the youth of to-day. Other articles in this section which make interesting reading are "Hyderabad under its Present Nizam", "Centuries in Dream" and "Our Sovereign".

The Urdu section occupies double the space of the English section, and the contributions here are varied and interesting. In the article on "Education in Hyderabad and Urdu" an attempt is made at a brief chronological study of the use of Urdu as the medium of instruction from early times down to the founding of the Osmania University. "The Labourers at the Osmania University" deals with the life and habits of such wandering tribes as Lambadas, Wadders, etc. Other articles of note in this section are: "New literary and scientific movements in Hyderabad", "Village Uplift in the Dominions during the Reign of His Exalted Highness", "The New period of Urdu Drama and Hyderabad", "Chand Bibi" etc.

SALIM BIN SAYEED.

The Bird with the Golden Voice and Three other Stories.
By Stella Mead. Publishers: Oxford University Press, Price 3½ As.

The Oxford University Press has been bringing out small story books which provide interesting reading matter for school children. They are graduated in style and are

meant for supplementary reading. English is a foreign language, very difficult for an Indian child to master. Therefore the work done in the class room should be supplemented by extensive reading outside to ensure a fair command of the language. A class-library with such up-to-date books carefully selected by the teacher of English will be a great step towards improving the standard of English in our schools.

The get-up of the book under review is attractive. It has 48 pages with an interesting illustration for each short story. The printing also is in sufficiently bold type. Children in the lower forms delight in fiction and fairy tales. A successful writer is one who is able to present the subject matter in simple, living and idiomatic English and who knows also how to grade his or her style. I have carefully gone through this small book. It is rich in idioms of every-day use and the sentences which occur are varied in construction. I consider that it will make a suitable book for extra reading for boys in Form IV.

T. A. Lingam.

Maker of Modern Hyderabad

LIEUT.-GENERAL HIS EXALTED HIGHNESS, RUSTUM-I-DOWRAN, ARASTU-I-ZAMAN, SIPAH SALAR, ASAF JAH, MUZAFFAR-UL-MULK-WAL-MAMALIK, NIZAM-UL-MULK, NIZAM-UD-DOWLAH, NAWAB SIR MIR OSMAN ALI KHAN BAHADUR, FATEH JUNG, SULTAN-UL-ULOOM, G.C.S.I., G.B.E., FAITHFUL ALLY OF THE BRITISH GOVERNMENT, *Nizam of Hyderabad and Berar.*

The Hyderabad Teacher

Silver Jubilee Number

February 1937

SPECIAL ARTICLES.

Our Benign Ruler.

Educational Progress under Asaf Jah VII.

The Jubilee Boy Scouts Rally.

The Jubilee Educational Exhibition.